

ابنِ صفی

جلد نمبر

32

جاسوسی دنیا

96- سہمی ہوئی لڑکی

97- قاتل کا ہاتھ



جاسوسی دنیا نمبر 97

قاتل کا ہاتھ

(دوسرا حصہ)

پیش رس

”قاتل کا ہاتھ“ حاضر ہے۔ کسی قدر تاخیر ہوئی۔ اُمید ہے کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں گے، ویسے بھی توقع ہے کہ آپ نے خود ہی خیال نہ فرمایا ہوگا کیونکہ آپ میں سے زیادہ افراد ”امتحانات“ کے چکر میں رہے ہوں گے لہذا تفریحی کتب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھا ہوگا۔ ہونا بھی یہی چاہئے۔ تفریحی کتب اسی لئے ہوتی ہیں کہ ان سے صرف ذہنی تھکن دور کر لی جائے۔ انہیں اوڑھنا اور بچھونا بنا لینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کر چکا ہوں۔ توقع ہے کہ آپ نے بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

ادھر پیش رس میں ”تبصرے“ کے شوق میں پڑھنے والوں نے عجیب قسم کے خطوط کی بھرمار کر رکھی ہے۔ یہ اتنے عجیب ہیں کہ اگر فرداً فرداً تبصرہ کرنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب الگ سے تیار ہو جائے۔

ان میں سے بہترے حضرات نے میری ”ذاتیات“ سے متعلق بھی بے نیکی قسم کے سوالات کئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ آخر اس سے پڑھنے والوں کو کیا سروکار کہ مجھے کرمیلے پسند ہیں یا

نہیں یا صرف نیم چڑھے کر لیے پسند آتے ہیں۔ ”میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا تھو“ کی عادت میں تو مبتلا نہیں۔ میرے کتنے بچے ہیں؟ دوسری شادی کی ضرورت پیش آئی تو پہلی بیوی تحریری اجازت نامہ دینے سے انکار تو نہیں کرے گی۔ اگر انکار کرے تو آپ کیا کریں گے؟ کوئی پیتے ہیں؟ نہیں پیتے تو وجہ لکھئے۔ کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عشق و محبت کے قائل نہیں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا کبھی کوئی گہری چوٹ کھائی تھی؟

”بہت بڑی چوٹ کھائی تھی یارو..... کہ پیدا ہو گیا تھا اور اب آپ جیسوں سے نیٹ رہا ہوں۔“

ڈوبو یا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ایک بار ایک عجیب حرکت اور بھی ہوئی ہے کسی صاحبزادے نے کتابوں کی پشت پر چھپنے والی میری حالیہ تصویر میں بڑی خوبصورت ڈاڑھی اور مونچھوں کا اضافہ کر کے ”برائے فوری توجہ“ مجھے بھجوائی ہے۔ لہذا ان کی تشفی کے لئے میں نے اس بار تصویر کا پوز بدل دیا ہے۔ ممکن ہے انہیں یکسانیت گراں گذری ہو۔ ہر معاملے میں مجھ سے نئے پن کے متوقع رہتے ہیں یار لوگ۔

اس ناول میں زیادہ تر پڑھنے والوں کی ایک خواہش پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سچ پوچھئے تو اسی خواہش کے احترام میں اس کہانی کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ بہر حال جنہوں نے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا وہ بھی کم از کم یہ تو کہہ ہی سکیں گے کہ ایسا ہونا چاہئے تھا۔

ابنِ صفی

لڑکی اور دھماکہ

دور کی پہاڑیوں پر برف چمک رہی تھی اور غروب ہوتے ہوئے سورج نے اُن پر ڈھیروں رنگ بکھیر دیا تھا۔ چمکدار نارنجی رنگ جس کی چھوٹ میلوں گہری وادی میں پڑ رہی تھی۔ موسم سرما کا چل چلاؤ تھا۔ خود رو جھاڑیوں میں رنگا رنگ کلیاں پھوٹنے لگی تھیں اور ان پر سارا دن چھوٹے چھوٹے پرندے منڈلایا کرتے۔

رام گڈھ میں سیاحوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہوٹل آباد ہونے لگے تھے۔ آنے والوں میں اندرون ملک کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ غیر ملکی سیاح خال خال ہی دکھائی دیتے۔ ویسے اس وقت تو ان کی بہتات ہوتی ہے جب میدانوں میں گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ بہر حال دور کی پہاڑیوں میں برف چمک رہی تھی اور کیپٹن حمید فزارو کی بالکنی میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ آخر وہ برف کب پگھلے گی جو خود اس کی کھوپڑی میں جمی ہوئی ہے۔ برف پگھلے تو شاید سمجھ میں آسکے کہ وہ یہاں کیوں پایا جاتا ہے۔

چند راتیں گذریں وہ اپنی خواب گاہ میں سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ جاگ

کر پہلے کان دبائے جب اس سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا تو تکیہ سر کے نیچے سے اوپر آ گیا لیکن گھنٹی کی آواز کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ بلا آخر جھلا کر اٹھ بیٹھا تھا اور ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں اس طرح دھاڑا تھا کہ اس کی دانست میں دوسری طرف والے کے کان کا پردہ خطرے میں پڑ گیا ہوگا۔

لیکن دوسری طرف کی ٹھنڈی سی آواز نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑادی۔ آواز فریدی کی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ ”نورالبارثی میں آ جاؤ۔“ بے اختیار حمید کی نظر ٹائم پیس پر پڑی۔ تین بجے تھے۔ وہ دانست پیس کر رہ گیا۔

”کیا پھر سو گئے۔“ دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔

”نہیں..... اعمال نامہ اٹھائے میدان حشر کی طرف دوڑ لگا رہا ہوں۔“

”دس منٹ کے اندر اندر پہنچو۔“ دوسری طرف سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور پھر جب وہ لیبارٹری میں پہنچا تو..... پہنچ تو گیا تھا کسی نہ کسی طرح..... اونگھتے ہوئے زینے طے کئے تھے لیکن لیبارٹری سے واپسی پر ایک بار پھر آئینہ دیکھا تھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑی تھیں اور جھلا کر کہا تھا ”معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

فریدی نے پلاسٹک کے ٹکڑے چپکا چپکا کر اس کی شکل اس حد تک تبدیل کر دی تھی کہ اُسے اپنی آنکھوں میں اجنبیت نظر آنے لگی تھی۔

نہ صرف صورت بدلی تھی بلکہ نام تک بدل گیا تھا۔ اب وہ کیپٹن ساجد حمید کی بجائے میجر سعید تھا اور اس کی جیب میں دو گھنٹے بعد والی فلائٹ کا ٹکٹ بھی موجود تھا۔ فریدی نے بتایا تھا کہ رام گڈھ کے ہوٹل فزارو میں اس کے لئے اسی نام پر کمرہ کل سے بک ہے۔ بس اُسے وہاں پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دینی پڑے گی۔ ظاہر ہے اس نے مقصد معلوم کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی لیکن وہ اب بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اسے عافیت اسی پر نظر آئی تھی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے چپ چاپ اس پر عمل کرے۔ وہ فریدی تھا۔ اُسے گوشت کی کسی دوکان پر بیٹھا کر قیے کی مشین کا ہینڈل گھمانے پر بھی مجبور کر رکھا تھا۔

آخر کچھ دنوں پہلے تک وہ ایک لیڈر ٹیلرنگ شاپ کی منجری کرتا ہی رہا تھا۔ اس کا علم ہوئے بغیر کہ اس کا مقصد کیا ہے درزیوں اور درزنوں کے ساتھ سرکھپاتا رہا تھا۔ پھر اچانک ایک دن درزی خانے میں تالا پڑ گیا تھا اور حمید کو پھر یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اس میں کام کرنے والوں اور والیوں کو زمین ہڑپ کر گئی تھی یا وہ عالم بالا کی طرف پرواز کر گئے تھے۔ ماہر نفسیات لڑکی رضیہ اکثر یاد آتی جس سے وہ خار بھی کھاتا تھا اور کسی قدر لگاؤ بھی محسوس کرتا تھا۔ پھر اس نے کتنا ہی سہارا تھا کہ اس حماقت کے آغاز و انجام کے بارے میں کچھ معلوم کر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ فریدی اس کی بات صاف اڑا جاتا۔ بہر حال درزی خانے سے رام گڈھ کے ہوٹل تک پہنچنے کا وقفہ دو ماہ سے زیادہ نہیں تھا۔

ابھی فزارو کے سارے کمرے آباد نہیں ہوئے تھے، پھر بھی خاصی چہل پہل تھی۔ ویسے فزارو میں قدم رکھتے ہی اُسے اچانک ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس ذہنی جھٹکے کا سبب وہ لڑکی تھی جسے رضیہ کے نام سے وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔ وہی ٹیلرنگ شاپ والی رضیہ جو اُسے ”نفسیات“ پر بور کیا کرتی تھی۔

لیکن وہ رضیہ یہاں فزارو کے ڈائینگ ہال میں اور ہی درج میں نظر آئی تھی۔ جدید ترین مغربی لباس میں تھی۔ سرخی پاؤڈر پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ حالانکہ درزی خانے میں حمید نے اس کے چہرے پر کبھی پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ بھی نہیں دیکھی تھی۔ لپ اسٹک تو سرے سے استعمال ہی نہیں کرتی تھی لیکن اب خدا کی پناہ..... ہونٹ تھے یا خون کبوتر۔ آرائش گیسو کا اسٹائل بھی بدلا ہوا تھا۔ بہر حال حمید اس کو رضیہ باور کر لینے سے ہچکچایا بھی تھا۔

ویٹروں سے وہ انگریزی میں گفتگو کرتی تھی لہجہ ایرانیوں کا سا تھا۔ حمید کو تو خیر وہ یوں بھی نہ پہچان سکتی کیونکہ درزی خانے میں بھی وہ میک اپ ہی میں رہا تھا۔ وہ اسے بار بار آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا۔ کبھی سوچتا رضیہ ہی ہے کبھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ دو افراد میں اس قدر مشابہت بھی ممکن ہے کہ کارخانہ قدرت میں کوئی بات بھی انہونی نہیں۔

لیکن پھر اس کی ایک کمزوری بھی یکنخت مشاہدے میں آئی۔ رضیہ کچھ سوچتے وقت اپنے

بائیں کان کو چنگی میں دبائے آہستہ آہستہ مسلتے رہنے کی عادی تھی۔ لہذا یہ حرکت اب بھی جاری تھی۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا یہ شغل دہرائی رہتی۔

بہر حال یہاں اس کی موجودگی پر حمید کو سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ٹیلرنگ شاپ میں وہ دن بھر اس سے الجھتی رہتی تھی۔ اکثر گاہکوں سے بھی لڑیٹھتی۔ حمید کو وہ پروقار عورت یاد تھی جس سے اس کا جھگڑا شلوار کی موریوں پر ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ موریوں میں بکرم نہیں رکھا گیا۔ رضیہ بھند تھی کہ عورت غلط کہہ رہی ہے۔

آخر کار دوسری لڑکی فرزانہ نے اس دن سے بکرم کا کام خود سنبھال لیا تھا اور پھر مستقل طور پر وہی اس فرض کو انجام دیتی رہتی تھی اور یہ بھی حقیقت ہی تھی کہ اس کے بعد سے بکرم کے سلسلے میں کوئی شکایت نہیں آئی تھی۔

حمید کو خیال تھا کہ یہاں اس کی اجنبیت اس کے لئے سوہان روح بن جائے گی۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس کی شکل دیکھتے ہی کوئی نفسیاتی بکمیڑا کر بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن وہ تو اس کی طرف متوجہ تک نہیں ہوئی تھی۔

ہاں تو اس وقت حمید فزارو کی دوسری منزل کی بالکنی پر کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کی رنگ افشائیوں میں کھویا ہوا تھا۔ بڑی خوبصورت شام تھی۔ پوری گھاٹی پر افق سے ابھرنے والے نارنجی رنگ کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔

دفعۃً اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس طوفان رنگ و نور کا کوئی حصہ اپنے سلسلے سے کٹ کر متحرک ہو گیا ہو۔ نارنجی رنگ کا وہ حصہ تیزی سے فزارو ہی کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ حمید نے گردن سے لٹکی ہوئی دو ربین سنبھالی اور اُسے آنکھوں تک لایا۔

”اوہ..... واہ.....!“ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

وہ تو ایک دہلی پتلی سی لڑکی تھی۔ نارنجی رنگ کے کوٹ میں ملبوس..... اور جب دو ربین کے شیشے پوری طرح ایڈجسٹ ہو گئے تو وہ گڑیا سی لڑکی بڑی دلکش نظر آئی۔ بہت ہی دلکش۔ اتنی دلکش کہ بے اختیار زبان سے ”حق ہے“ کا نعرہ سرزد ہو گیا۔

وہ فزارو کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کیا..... کوئی اور بھی تو تھا جیسے وہ نارنجی کوٹ والی لڑکی کی بے خبری میں اس کے پیچھے لگ گئی ہو۔ کیونکہ نارنجی کوٹ والی لڑکی دفعتا چلتے چلتے رک کر پیچھے مڑی تھی اور تعاقب کرنے والی اس طرح زمین پر جھک گئی تھی جیسے کوئی گری ہوئی چیز اٹھا رہی ہو۔

نارنجی کوٹ والی لڑکی پھر تیزی سے عمارت کی طرف چل پڑی۔
 تعاقب کرنے والی اب سیدھی کھڑی تھی۔ حمید نے دوبارہ شیشے ایڈجسٹ کئے اور اچھل پڑا۔ تعاقب کرنے والی وہی لڑکی رضیہ تھی۔ ایسی مشابہت ابھی تک تو اس کے تجربے میں نہیں آئی تھی کہ عادات و اطوار تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہوں۔
 یہ نارنجی کوٹ والی لڑکی جس کا تعاقب کر رہی تھی ابھی تک فزارو میں نہیں دکھائی دی تھی۔
 ہو سکتا تھا کہ اس کے دوران قیام سے قبل وہاں آتی رہی ہو۔

اس نے اپنے کمرے میں واپس آ کر دور بین رکھی اور نیچے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ اس دہلی سی لڑکی کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ ڈائینگ ہال کی ایک میز پر نظر آئی۔ سامنے چائے دانی رکھی تھی۔ لڑکی کا چہرہ پرسکون تھا۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ اُسے اس تعاقب کا علم رہا ہو۔

ڈائینگ ہال میں رضیہ کہیں نہ دکھائی دی اس وقت پورے ہال میں حمید سمیت صرف پانچ افراد تھے۔

حمید نے لڑکی کو چائے انڈیلے دیکھا۔ کچھ عجیب سا چہرہ تھا اس کا جو کسی زاویے سے تو بے حد معصوم نظر آتا تھا اور کسی زاویے سے اس میں جہاندیدگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتیں۔
 ہونٹوں میں رہ رہ کر ہلکی ہلکی جنبش ہوتی اور بالکل ایسا ہی لگتا جیسے ذہن میں چکرانے والی کسی بات کو ہونٹوں تک آنے سے روک دینے کی کوشش کر رہی ہو۔

حمید نے اپنے لئے اس کے قریب ہی کی ایک میز منتخب کی تھی اور اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ چائے کی پہلی چسکی لے کر اس نے بُرا سامنہ بنایا اور شکر دان سے شکر نکالنے لگی۔ شاید

شکر ڈالنا بھول گئی تھی۔

خفیف سی مسکراہٹ اور سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں نے اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر پیدا کر دیا تھا۔

وہ اُسے چائے پیتے دیکھتا رہا۔ کیا وہ کہیں باہر سے آئی ہے؟ اس نے سوچا لیکن باہر سے آئی ہوتی تو پیدل نہ ہوتی۔ اسٹیشن سے یہاں تک مسافت رکشے کے بغیر طے کرنا مشکل ہی تھا۔ دفعتاً عمارت کے کسی گوشے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہ اچھل پڑی۔ پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے اوپر الٹ گئی تھی۔

اور دوسرے ہی لمحے میں بھلا حید اس کے قریب کیوں نہ نظر آتا۔

”ٹھہریے ٹھہریے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”یونہی بیٹھی رہئے، ورنہ یہ نامعقول چائے۔“ پھر رومال جیب سے نکال کر اس کی طرف جھکا ہی تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”شکریہ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ”یہ دھماکہ کیا تھا۔“

”دھماکہ۔“ حید نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”کیسا دھماکہ۔“

”یہ بھی ہوا تھا۔“

”میں نے دھیان نہیں دیا۔“

”دھماکہ ہی کی بناء پر تو۔“

”اچھی بات ہے۔ ٹھہریے۔ میں دیکھتا ہوں۔“

اتنی دیر میں کاؤنٹر کلرک اپنی جگہ سے غائب ہو چکا تھا۔ بقیہ تین آدمی بھی آواز کی طرف دوڑے گئے تھے۔

ہال میں اب ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

دفعتاً وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”ٹھہریے..... میں تنہا رہ جاؤں گی۔“

”جی ہاں..... واقعی..... کیسی بھول ہونے والی تھی مجھ سے۔“

”وہ لوگ جو گئے ہیں معلوم ہی کر لیں گے۔“

”جی ہاں..... یہ بات تو ہے۔“

”کیا میں آپ کو خوفزدہ معلوم ہوتی ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ آپ ایک باہمت لڑکی معلوم ہوتی ہیں۔“

”شکریہ۔ اب یہیں بیٹھ جائیے۔“ نارنجی کوٹ والی نے کہا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ حمید ہی کا

روبال اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ اپنے کوٹ کے دامن پر پھیرے جارہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا

کہ لڑکیوں کے معاملے میں واقعی اس کے ستارے بے حد شاندار ہیں۔ لیکن وہ دھماکہ۔ وہ

دھماکہ کیا تھا۔ عمارت کے کسی قریبی حصے سے آواز آئی تھی۔

ذرا ہی سی دیر بعد کاؤنٹر کلرک نے کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا ”کوئی

پریشانی کی بات نہیں جناب۔ کچن میں ایک آئیل اسٹوو پھٹ گیا تھا۔ کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا۔“

”اوہ.....!“ لڑکی نے ایک طویل سانس لی اور خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

”دیکھا آپ نے۔“ حمید نے اس سے کہا۔ ”اسی لئے میں نے اس کی طرف توجہ دینے

کا حق محفوظ رکھا تھا۔“

وہ پھر ہنس دی اور بولی۔ ”میں نسلًا چنگیزی ہوں۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر پہلے میں بہت خوفزدہ تھا۔“

”کیوں.....؟“

”آپ کو دیکھ کر ہیبت سی چھا گئی تھی مجھ پر۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دل کے بغداد پر

تاریخوں نے ہلہ بول دیا ہو۔“

اس کی بے آواز ہنسی بڑی دلکش تھی۔

”یہ اسٹوو کیسے پھٹ جاتے ہیں؟“ اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کا بوائیلر.....!“

”اسٹوو میں بوائیلر کا کیا کام.....!“

”نہیں ہوتا.....؟“ حمید نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”قطع نہیں۔“

”تب تو شاید میں جانتا ہی نہیں کہ اسٹو کیا چیز ہے۔ پھر آپ کو کس طرح بتاؤں کہ کیسے پھٹ جاتا ہے۔“

”مجھے غصہ بہت جلد آ جاتا ہے۔“

”اب تا وقتیکہ مجھے غصے کی صحیح تعریف نہ معلوم ہو جائے اپنی زبان بندی رکھوں گا۔“
 ”ارے.....!“ وہ یک یک چونک کر بولی۔ ”آپ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں..... کیوں؟ اپنی میز پر جاییے؟“

”بہت بہتر۔“ حمید نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور اپنی میز پر واپس آ گیا۔ وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔ نہ صرف مسکرائی بلکہ اٹھ کر سیدھی اسی کی میز پر چلی آئی۔

”اب آپ مجھے بھگا دیجئے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”بدلہ ہو جائے گا۔“

”میں چنگیزی نہیں ہوں۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اوہو..... آپ تو سچ بچہ برامان گئے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”چہرے سے تو پریشانی نہیں ظاہر ہوتی۔“

”بس میں ہر وقت خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔“

”چیف پورٹ سے۔“

”شکاری ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“

”کیا مطلب.....؟“

”کیا میں صورت سے شکاری لگتا ہوں۔“

”نہیں صورت سے تو شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”میں ایک بہت بڑے شکاری کا سیکرٹری ہوں۔“

”شکاری بھی سیکرٹری رکھتے ہیں۔“

”شکاری ہی تو سیکرٹری رکھتے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”آپ یہیں مقیم ہیں۔“ حمید نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں.....!“

”لیکن میں نے تو آج ہی دیکھا ہے۔“

”زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔“

”آپ بھی باہر ہی سے آئی ہیں۔“

”جی ہاں..... نصیر آباد سے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے ڈیڑی جھکی ہیں۔ ورنہ اس موسم

میں یہاں کیوں آتے۔ رام گڈھ کی سردیاں تو رہ کر پلٹتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لومڑیوں کے

شکاری ابھی تک یہاں مقیم ہیں۔“

”شکاری ہیں۔“

”ارے نہیں۔ وہ بے چارے تو نصیر آباد کے نیشل کالج میں کیمسٹری پڑھاتے ہیں۔“

”خوب.....!“

”آپ کو یقین نہیں آیا۔“

”بالکل آگیا۔ نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”میں آپ کی آنکھوں میں بے اعتباری دیکھ رہی ہوں۔“

”آںکھوں پر نہ جاییے۔ یہ عموماً دھوکا ہی دیتی ہیں۔“

”میں لوگوں کی آنکھوں سے پہچان لیتی ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔“

”اور اگر کسی پتھارے کی ایک ہی آنکھ ہو تو.....!“

”اوہ تو کیا میں سارے زمانے کی آنکھیں دیکھتی پھرتی ہوں۔“

”میری آنکھوں میں کیا نظر آیا آپ کو۔“

”آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ واضح رہے۔“

”نہیں..... نہیں تو۔“ وہ ہنس پڑی۔

”غور سے دیکھئے۔“

وہ آگے جھک آئی اور حمید نے بوکھلا کر کہا۔ ”کہیں آپکے ڈیڈی نہ آجائیں۔ سپر ہی بیٹھے۔“

”ڈیڈی یہاں نہیں ہیں۔“

”پھر کہاں ہیں۔“

”کیمسٹری کے سلسلے میں کوئی نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ اس کے لئے فضا میں ایک مخصوص

درجہ حرارت چاہئے اور وہ اس درجہ حرارت کی تلاش میں سطح سمندر سے کچھ اور اوپر چلے گئے

ہیں۔ ان پہاڑوں پر جہاں اب بھی برف دکھائی دیتی ہے کیا سمجھے۔“

وہ مضحکہ اڑانے کے انداز میں ہنسنے لگی۔

”آپ کو یہاں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔“

”میں تنہا کب ہوں۔ اتنے لوگ اور موجود ہیں۔“

”میں نے یہاں ایک غیر ملکی لڑکی بھی دیکھی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”غالباً ایرانی ہی ہو سکتی ہے۔“

”اونہہ.....!“ وہ بُرا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

”کیوں؟ کیا آپ کو اس کا تذکرہ بھی ناگوار گذرا ہے۔“

”بالکل۔ مجھے تک چڑھے لوگ پسند نہیں۔ وہ بہت مغرور معلوم ہوتی ہے۔“

”مغرور..... یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ۔“

”میں نے ایک آدھ بار اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا رویہ تو بین آئینز

ہو گیا تھا۔“

”اوہ..... تو کیا اس نے آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کیا تھا۔“

”بُرا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔“

”ممکن ہے اُسے اردو نہ آتی ہو۔“

”تو کیا آپ نے اُسے اردو میں مخاطب کیا تھا۔“

”انگریزی آتی ہے آپ کو۔“ حمید نے چڑانے کے لئے حیرت ظاہر کی۔

”اب آپ میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”آپ غلط سمجھیں۔ دراصل آپ صورت سے یعنی کہ..... کہنے کا مطلب یہ کہ آپ کی

شکل بالکل مولویوں جیسی ہے اس لئے میں نے سوچا۔“

”یہ مولویوں جیسی شکل کیسی ہوتی ہے۔“ اس نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

”مولویوں جیسی..... یعنی کہ بس..... مولویوں جیسی۔“

اس اجمال کی تفصیل حمید کے بس سے باہر تھی۔ اس لئے ہکٹانا ہی پڑا۔ اس پر لڑکی نے

کئی ایسے مولویوں کے نام گنوائے جنہیں انگریزی آتی تھی۔ لہذا حمید نے تسلیم کر لیا کہ اس کی

شکل مولویوں جیسی نہیں تھی۔

”مجھے ایسے لوگ پسند نہیں جو مولویوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔“ لڑکی نے جھلائے ہوئے

لہجے میں کہا۔

حمید نے یہ سوچ کر بات اڑا دینی چاہی کہ بعض لوگ مذہب کے معاملے میں بڑے

جذباتی ہوتے ہیں۔

”نہیں آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ غلط راستے پر ہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”بھلا آپ کو میرے راستے کا علم کیونکر ہوا۔“

”آپ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں جو مولویوں کی جہالت کا ماتم کرتے ہوئے

اپنی لاشوں پر سے بھی گذر جاتے ہیں۔“

”بھئی یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ ڈائلاگ تھا کچھ فلمی انداز کا۔“

”کیا آپ فلمیں بہت دیکھتی ہیں۔“

”یقیناً دیکھتی ہوں۔ پھر.....!“

”آپ غلط رہتے پر ہیں۔“

”کیوں.....؟“

”مولویوں سے پوچھئے۔“

وہ چند لمحے حمید کو گھورتی رہی پھر ہنس کر بولی۔ ”دراصل میں بہت باتونی ہوں کئی دنوں

سے کوئی ملا نہیں تھا۔“

وہ خواہ مخواہ ہنستی رہی۔

”اچھا تو اب ہم اس ایرانی لڑکی کے بارے میں باتیں کریں گے۔“ حمید نے کچھ دیر بعد کہا۔

”کیوں..... کیوں.....!“

”وہ یہاں کب سے مقیم ہے۔“

”میں کیا جانوں۔ جب میں آئی تھی تو اُسے یہیں دیکھا تھا۔“

”اسی دن یا دوسرے دن۔“

مجھے یاد نہیں۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ”میری نظروں میں اس کی کیا اہمیت ہے کہ اس

طرح یا درکھتی۔“

”کیا خیال ہے۔ وہ تنہا ہی ہے یا اور کوئی بھی اس کے ساتھ ہے۔“

”ارے تو کیا میں اس کی ٹوہ میں رہتی ہوں۔“

”قدرتی بات ہے محترمہ۔ اس کا سلوک آپ سے اہانت آمیز تھا۔“

”میں جوتے کی نوک پر مارتی ہوں ایسوں کو۔ میں کیوں رہنے لگی ٹوہ میں۔“

”خیر..... خیر..... گولی ماریئے۔“

”میں شکاری نہیں ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”اچھا اگر وہ آپ کی ٹوہ میں رہتی ہو تو پھر.....!“

”میں کہتی ہوں اس کا قصہ ختم کیجئے۔ ورنہ میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔“

”ختم..... ختم..... بالکل ختم.....!“

”میں نے بھی آپ کو آج سے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کب سے مقیم ہیں۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”کئی دن سے۔“ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرے ڈیڈی نے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی کہ اپنے کمرے ہی تک محدود رہوں۔“

”تو میرے ہی ڈیڈی نے کب دی ہے؟“ وہ پھر جھنجھلا گئی۔

”درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ خدا آپ کو بھی سطح سمندر سے کافی اونچائی پر پہنچائے۔“

”میں اب قطعی نہ بولوں گی۔“

”پھر آپ کس قسم کی باتونی ہیں۔“

وہ سچ سچ کچھ نہ بولی۔ چہرے پر کبیدگی کے آثار تھے۔

”اب میں شدت سے بور ہو رہا ہوں۔“ حمید کچھ دیر بعد بولا۔

”کیوں.....؟“

”کس سے باتیں کروں۔“

وہ ہنس پڑی۔ حمید کو عجیب سی لگی وہ لڑکی۔ موڈ تبدیل ہونے میں دیر ہی نہیں لگتی تھی۔

ابھی شکن ہے ماتھے پر اور ابھی آنکھیں کنول کی طرح کھل گئیں ان میں مسرت ناپنے لگی۔

”دفعۃً وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔“

”ڈیڈی.....!“ وہ اس کی چیخ ہی تھی۔ پھر حمید نے اُسے صدر دروازے کی طرف جھپٹتے دیکھا۔

اجنبی

صدر دروازے میں ایک عجیب الثقت آدمی کھڑا نظر آیا۔ اس کا قد پونے پانچ فٹ سے

زیادہ نہ رہا ہوگا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ نحیف الجشہ بھی تھا۔

لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس کا پورا چہرہ ڈاڑھی سمیت خون سے تر تھا۔
دو آدمی سہارا دیئے ہوئے اس کو ڈائینگ ہال میں لا رہے تھے۔

”ڈیڈی..... یہ کیا ہوا۔ یہ کیا ہوا۔“ وہ پھر چیخی۔

”ادھر ہٹئے۔“ حمید نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”آپ دیکھ نہیں
رہیں کہ وہ خود سے چل بھی نہیں سکتے۔ کمرے کی طرف چلئے۔“

حمید محسوس کر رہا تھا کہ بوڑھے پر نیم بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی
تھیں اور وہ اس طرح پلکیں جھپکاتا رہا تھا جیسے کچھ بھائی نہ دے رہا ہو۔ ان کا کمرہ بھی دوسری ہی
منزل پر تھا اس لئے بوڑھے کو ہاتھوں پر اٹھا کر زینے طے کئے گئے۔

کمرے میں پہنچ کر لڑکی نے بڑی تیزی سے بستر درست کیا۔ فزارو کا منیجر بھی ان کے
ساتھ یہاں تک آیا تھا اور بوڑھے کو گہری تشویش کے ساتھ دیکھتا رہا تھا۔

”یہ ہوا کیسے.....؟“ اس نے ان دونوں آدمیوں سے پوچھا جو پروفیسر کے ساتھ آئے تھے۔

”یہ ہمیں بھرتو نالے کے قریب پڑے ملے تھے۔“ ایک نے جواب دیا۔ ”ہوش میں تھے

اور انہوں نے خود ہی ہمیں یہاں کا پتہ دیا تھا۔“

حمید نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ اب بستر پر چٹ پڑا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ حمید

نے منیجر سے کہا۔ ”ڈاکٹر کو فون کیجئے۔“

”میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”کیا کہا..... کیا مطلب.....!“

”ارے صاحب آپ اپنا کام کیجئے۔ آپ سے کیا سروکار.....!“

”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں۔“

”بالکل ہوش میں ہوں اور آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات

میں دخل اندازی مت کیجئے۔“

حمید نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ویسے منیجر کا کبجہ اُسے اتنا گراں گزرا تھا کہ شاید اُسے مار

بیٹھتا لیکن اس بے تکی پوزیشن کو سمجھنا بھی تو تھا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ لڑکی بولی۔

”کیا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”یہ ڈیڈی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا۔“

”آپ لوگ براہ کرم میرے ساتھ آئیے۔“ منیجر نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے

کہا۔ اشارہ ان دونوں کی طرف بھی تھا جو بوڑھے کو یہاں تک لائے تھے۔ حمید نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال اسی کے مشورے پر عمل کیا جائے، معاملات کو سمجھنا بھی تو تھا۔

لیکن اُسے یقین تھا کہ لڑکی یہ نہیں چاہتی۔ کم از کم وہاں اس کی موجودگی کی متنی تھی۔ اس نے لاپرواہی سے شانے جھکائے اور منیجر کے پیچھے چل پڑا۔

پھر وہ تینوں منیجر کے آفس میں داخل ہوئے۔ لیکن حمید کے قدم ٹھکے تھے۔ رضیہ وہاں موجود تھی۔ ایک آرام کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔

”اوہ آپ یہاں ہیں۔“ منیجر نے انگریزی میں حیرت ظاہر کی۔

”ہاں آں.....!“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”ادھر نکلی آئی تھی۔ تم نہیں تھے۔ یہ

کتاب اٹھالی اور دیکھنے لگی۔ کیا یہاں میری موجودگی غیر ضروری ہے۔“

”نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں آپ بیٹھے۔“ منیجر جلدی سے بولا۔

رضیہ..... رضیہ..... حمید ایک بار پھر الجھن میں پڑ گیا۔ یہ سو فیصدی رضیہ کی آواز تھی۔

صرف لہجہ بدلا ہوا تھا وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

منیجر نے ان دونوں سے پوچھا۔ ”آپ کی دانست میں اسکا معاوضہ کم سے کم کتنا ہونا چاہئے۔“

”ہمارے بیس روپے خرچ ہوئے ہیں یہاں تک لانے میں۔“

منیجر نے میز کی دراز سے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور ان کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

”تمیں لے جائیے شکریہ۔“

ایک نے ہاتھ بڑھا کر روپے لئے اور انہیں جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ ”میرا پتہ لکھ لیجئے۔ اگر پولیس وغیرہ کا کوئی چکر ہو تو ہمیں بلوا لیجئے گا۔“

”وہ سب ٹھیک ہے۔“ فیجر نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

وہ دونوں چلے گئے اور حمید نے محسوس کیا کہ فیجر اسے اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

”اب آپ فرمائیے جناب۔“ بلا آخراں نے اُس سے پوچھا۔

”میں آپ سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔“ حمید کا جواب تھا۔

”کیا سننا چاہتے ہیں۔“

”یہ سب کیا تھا۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔ آپ یہاں کب سے مقیم ہیں۔“

”تین دن سے۔“

”ان لوگوں کو کب سے جانتے ہیں۔“

”آپ کو اس سے کیا سروکار۔“ حمید جھنجھلا گیا۔

”پس ثابت ہوا کہ آپ ان لوگوں کو صرف تین دن سے جانتے ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”میں تین سال سے جانتا ہوں۔“ فیجر میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔

”اے تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔“

”کیا تم لوگ جھگڑا کر رہے ہو۔“ رضیہ نے چونک کر انگریزی میں پوچھا۔ اس کے

چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے۔

”جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ فیجر نے دانت نکال دیئے۔

”آپ مجھ سے گفتگو کیجئے۔“ حمید نے اُسے پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”آپ سے کیا گفتگو کروں۔ جائیے آرام کیجئے۔“

”ابھی میرے آرام کا وقت بہت دور ہے۔“ حمید نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں کہتا ہوں آخر آپ.....!“

”بس.....!“ حمید نے ہاتھ اٹھا کر اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں پتہ نہیں کس قسم کا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ آپ کا فرض نہیں ہے کہ آپ اس حادثہ کی اطلاع پولیس کو دیں۔“

”آپ سے مطلب.....!“ منیجر نے پھر آنکھیں نکالیں۔

”اچھا تو اب میں خود ہی.....!“

”جی..... جی..... تو پھر آپ خود ہی..... کیا.....؟“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ ایک نروس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اور مضطربانہ انداز میں میز پر رکھی ہوئی چیزوں کی جگہیں تبدیل کر رہا تھا۔

”میں خود ہی اس واقعہ کی اطلاع پولیس کو دے دوں گا۔“ حمید نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”پھر آپ جانے۔ جب تک وہ زخمی آدمی خود ہی اپنی کیفیت بتانے کے قابل نہ ہو جائے.....

آپ کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔“

”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”مجھے کون روکے گا۔“

”میں کہتا ہوں آپ کو اس سے کیا۔ سب سے زیادہ فکر اس کی لڑکی کو ہونی چاہئے۔“

”لڑکیاں فکر کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوئیں۔ انہیں بے غم دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر اسی سے جا کر پوچھئے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں اُسی سے پوچھوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔ آپ میرے کسی بھی گاہک کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتے۔“

”کون روکے گا مجھے۔“

”دیکھئے..... دیکھئے حضرت میں نہیں جانتا آپ کون ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولئے کہ یہاں کئی

بہت ہی خطرناک قسم کے شکاری بھی مقیم ہیں جن سے میں دوستانہ تعلقات رکھتا ہوں۔“

”بہت خوب..... میں ان کی زیارت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں

کہا۔ وہ یہاں کے شکار اور شکاریوں سے بخوبی واقف تھا۔ سردیوں بھر یہاں بڑے بالوں والی لومڑیوں کا شکار ہوتا ہے۔ ملک کی تجارتی فرموں کے ملازم پیشہ ور شکاری اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مخالفتیں بھی ہوتی ہیں۔ پھر رائفلوں کا رخ لومڑیوں کی طرف سے آدمیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ شکاریوں کی تعداد کم ہوتی رہتی ہے لیکن لاشیں تو اسی وقت ملتی ہیں جب برف پکھلتی ہے۔

حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پھر بولا۔ ”اب یہیں بیٹھ کر کسی شکاری کا انتظار کروں گا۔ ویسے جب میں شکار کھیلتا ہوں تو یہ نہیں دیکھتا کہ شکار ہونے والا منیجر ہے یا باورچی۔“

”آپ میری تو ہین کر رہے ہیں۔“ منیجر غرایا۔

لیکن حمید کچھ کہے بغیر رضیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بدستور کتاب میں مستغرق تھی۔ چہرے سے ہرگز مترشح نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کی گفتگو سنتی اور سمجھتی رہی ہے۔ لہذا ایک بار پھر حمید کو سوچنا پڑا کہ کہیں وہ اس کے بارے میں غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں۔

”آپ کی تعریف.....!“ دفعتاً حمید نے نکٹھیوں سے رضیہ کی طرف اشارہ کر کے منیجر سے پوچھا اور منیجر متحیرانہ انداز میں منہ کھول کر رہ گیا۔ پھر حمید کسی قدر مسکرایا اور بائیں آنکھ بھی دبائی بس پھر کیا تھا۔ منیجر کی حیرت جھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔

”صاحب آپ کس قماش کے آدمی ہیں۔“ اس نے کھر کھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا موضوع کی تبدیلی پسند نہیں آئی آپ کو۔“ حمید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”خدا کے لئے تشریف لے جائیے ورنہ.....!“

”ورنہ کیا.....؟“

”ورنہ یہ کہ ہم اپنے بزنس کے حقوق محفوظ رکھتے ہیں۔ کسی لمحہ بھی آپ کو ہول چھوڑ دینے کا نوٹس مل سکتا ہے۔“

”کون نوٹس لیتا ہے ایسی باتوں کا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے حمید کو گھورتا رہا۔

”تعارف ہو جائے تو کیسی رہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”یہ عیاشی کا اڈا نہیں ہے۔ تشریف لے جائیے۔“ اس بار اس نے بہت زیادہ غصے کا

مظاہرہ کیا۔

”اے جناب۔ خود کو قابو میں رکھئے کیا میں کوئی عیاش آدمی ہوں۔“

”دی مین ازاے سوشل اینمل..... دوسروں سے جان پہچان پیدا کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”میں کہتا ہوں تشریف لے جائیے۔“ وہ مٹھیاں بھیج کر بولا۔

”میں آپ دونوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیا مطلب.....؟“ وہ میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔

”پلیز.....!“ رضیہ کی ہم شکل اچھل پڑی۔ ”میں اختلاج قلب کی مریضہ ہوں۔“

”میں خیرہ مروارید لاؤں۔“ حمید نے چمک کر پوچھا۔ لیکن وہ بُرا سامنہ بنائے ہوئے

پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سچ مچ بے حد مغرور معلوم ہوتی تھی۔

”اب آپ چلے ہی جائیے۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“ منیجر اٹھتا ہوا بولا۔ اس کے ہاتھ اب اور

زیادہ کاپٹے لگے تھے۔

حمید نے سوچا بات نہ بدھانی چاہئے۔ پتہ نہیں فادر ہارڈ اسٹون نے اسے یہاں کس

مقصد کے تحت بھیجا ہو۔

جب وہ دروازے سے گزر رہا تھا منیجر نے پھر اُسے بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ”یہ

وارنٹک ہے کہ اس وقت انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور دروازے سے گزر گیا۔

بہر حال بات الجھن پیدا کرنے والی تھی۔ نہ تو اس نے خود ہی زخمی کے لئے طبی امداد

فراہم کی تھی اور نہ یہی چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس معاملے میں دخل اندازی کرے۔

حمید پھر ڈائیننگ ہال میں واپس آ گیا۔ اب کافی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہال کی زیادہ تر

میزیں آباد ہو چکی تھیں۔

وہ سیدھا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ کاؤنٹر کلرک اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے جا رہا تھا۔ حمید نے اپنے تمباکو کی پاؤچ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کبھی پرنس ہنری بھی ٹرائی کیجئے۔“

”شکریہ جناب..... اچھا ہاں۔ تعریف سنی ہے اس برائے کی..... بہت بہت شکریہ۔“

وہ پاؤچ سے تمباکو نکال کر اپنی ناک کے قریب لے گیا اور پھر اُسے پائپ میں بھرتا ہوا بولا۔ ”عمدہ چیز ہے۔ یہاں تو ملتی ہی نہیں۔“

”کیوں صاحب! اگر یہ اپنا دیسی تمباکو پائپ میں جلایا جائے تو کیسی رہے۔ لیکن وہ تو ایک ہی کش میں بھک سے اڑ جائے گا۔ پتہ نہیں پائپ کے تمباکو میں نمی کیسے پیدا کرتے ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا اور کاؤنٹر کلرک خاموش ہو کر پائپ سلگانے لگا۔ کچھ دیر بعد حمید نے پوچھا۔ ”یہ آئیل اسٹو کیسے پھٹ گیا تھا۔“

”پتہ نہیں جناب۔“

”اوہ..... خوب یاد آ گیا۔ وہ کون صاحب تھے۔ زخمی تھے پتہ نہیں اب کیا حال ہو۔“

”میرزا خیال ہے کہ شاید آپ بھی ان کے ساتھ اوپری منزل پر گئے تھے۔“

”ہاں آں..... گیا تھا۔ اس سے قبل اس لڑکی ہی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن میں ان لوگوں کو جانتا نہیں۔ اُنکے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ لڑکی سے کچھ دیر پہلے ہی ملاقات ہوئی تھی۔“

”بڑی شریف لڑکی ہے۔“ کاؤنٹر کلرک بولا۔

”پتہ نہیں بھلا اتنی جلدی کیسے رائے قائم کی جاسکتی ہے۔“ حمید نے بے تکلفی سے کہا۔

”میں تو جانتا ہوں۔ یہ لوگ ہر سال سردیوں میں آتے ہیں۔“

”شکاری ہیں۔“

”نہیں جناب۔ اسی پر تو مجھے حیرت ہے۔ وہ زخمی جسے آپ نے دیکھا تھا یعنی لڑکی کا باپ نصیر آباد کے کسی کالج میں پروفیسر ہے۔ پروفیسر ندیم چنگیزی..... عالم آدمی ہے۔ بھلا اسے لومڑیوں کے شکار سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن سردیاں گزارتا ہے یہاں۔“

”جی ہاں..... ابھی تک تو یہی دیکھنے میں آیا ہے۔“

”لڑکی بھی ساتھ ہوتی ہے؟“

”جی ہاں..... وہ بھی ہوتی ہے۔ لیکن آج تک میں نے اُسے رنگ رلیوں میں حصہ لیتے

نہیں دیکھا۔“

”اس کا بھی کوئی ایسا ہی نام ہوگا۔ تبسم چنگیزی۔ مجسم چنگیزی وغیرہ۔“

”پتہ نہیں۔ ویسے بوڑھا اُسے مونی کہہ کر پکارتا ہے۔“

”ممکن ہے اصل نام معینہ ہو۔“

”معینہ تو خوبصورت نام نہیں کہلایا جاسکتا۔“ کلرک نے بچھے ہوئے پائپ کو سلگاتے

ہوئے کہا۔

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر حمید نے کہا۔ ”بڑی حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک زخمی کے لئے

میڈیکل ایڈ نہیں آئی۔“

”لیکن اس کے باوجود وہ صبح کو بالکل تروتازہ نظر آئے گا۔“

”کیا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔“

”پچھلے سال کم از کم پندرہ بار ایسی ہی غیر معمولی حالتوں میں باہر سے واپس آیا تھا۔“

”اچھا تب تو اس نے خود ہی منبر کو اس سے متعلق کچھ مخصوص ہدایات دے رکھی ہوں گی۔“

”کیسی مخصوص ہدایات۔“

”یہی کہ اگر وہ خراب حالت میں واپس آئے تو اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ میڈیکل ایڈ

وغیرہ کی فکر قطعی نہ کی جائے۔“

”ہو سکتا ہے جناب۔ میری معلومات اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ مجھے غیر ضروری باتوں کی

فکر قطعی نہیں ہوتی۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔ آپ ایک با اصول آدمی ہیں۔“

”اصول کی تو بات ہی نہ کیجئے۔ اب یہی دیکھ لیجئے پورے بیس سال سے معمول ہے کہ صبح اٹھ کر پہلے گرم پانی سے غرارتے کرتا ہوں اور پھر سروسوں کے تیل سے دانت مانجھتا ہوں۔ آج تک دانتوں میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔“

”سروسوں کے تیل کا کیا کہنا۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کسی سے ان کی شناسائی بھی نہ ہوگی۔“
 ”کس کی شناسائی۔“

”پروفیسر اور اس کی لڑکی کی بات کر رہا تھا۔“

”میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ لیکن بٹھریئے۔“ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”اکثر اجنبیوں سے میں نے بوڑھے کو گفتگو کرتے دیکھا ہے۔“
 ”اجنبی..... اجنبیوں سے کیا مراد ہے آپ کی۔“

”یہی کہ وہ قیام کرنے والوں میں سے نہیں ہوتے۔“

”اچھا..... اچھا..... سمجھ گیا۔“

کچھ دیر کے لئے وہ پھر خاموش ہو گئے۔ حمید اپنے پاپ میں تمباکو بھرنے لگا۔
 ”آپ تو غالباً شکاری بھی نہیں ہیں۔“ کاؤنٹر کلرک نے کہا۔

”نہیں میں ایک شکاری کا دوست ہوں۔ شکاری صاحب ابھی یہاں نہیں پہنچے۔“
 ”لیکن اب تو سیزن ختم ہو رہا ہے۔“

”دراصل اگلے سال یہاں شکار کھیلے گا۔ فی الحال امکانات کا جائزہ لے گا۔“

”شکار ہی شکار ہے جناب یہاں۔ امکانات کا کیا سوال۔ میں آپ کے دوست کو ایک پرانے اور مقامی شکاری سے ملوا دوں گا۔“

حمید نے اپنے سر کو جنبش دے کر اظہار تشکر کیا اور نہایت پر فکر لہجے میں بولا۔ ”میں اس بوڑھے پروفیسر کے لئے پریشان ہوں۔ پتہ نہیں کس حال میں ہو۔“

”بات دراصل یہ ہے جناب! آپ کے ساتھ منجر صاحب بھی تھے اور مجھ سے یا آپ سے زیادہ اس سلسلے میں انہیں تشویش ہونی چاہئے۔“

”اسی بات کا تو غم ہے کہ انہیں بھی تشویش نہیں۔“

”بس تو پھر آپ بھی بے فکر ہو جائیے۔“

حمید نے طویل سانس لی اور غمناک انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سر جھکا لیا۔

”صاحب آپ واقعی بہت رحم دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تو کوئی شکار کے یزن

میں ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔ خون بہتا ہی رہتا ہے۔ لاشیں گرتی ہی رہتی ہیں۔“

”میرے دوست نے ان اطراف میں کبھی شکار نہیں کیا۔“

”تب پھر وہ کھیل بھی نہ سکیں گے۔ یہاں سے لے کر ٹیکم گڈھ تک یہی کچھ ہوتا ہے۔

اس یزن میں نہ کوئی چیخوں پر چونکتا ہے اور نہ خون بہتے دیکھ کر کسی کے کان پر جوں رینگتی ہے۔“

”بھی کس مصیبت میں آپھنسا۔“ حمید نے اکتاہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”میرے لئے یہیں کافی منگوا دیجئے۔ کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں گا۔ آہا..... اور وہ لڑکی۔“

”کوئی لڑکی جناب۔ اچھا سمجھ گیا۔ آپ کا اشارہ شاید اُن ایرانی خاتون کی طرف ہے۔“

”ایرانی.....؟ لاجول ولا قوۃ..... میں ترک سمجھتا تھا۔“

”جی نہیں..... ایران سے آئی ہیں۔ مصنفہ ہیں۔ بھلا سا نام ہے۔“

”ظہریئے..... رجسٹر میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ کلرک رجسٹر کی ورق گردانی کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”نام بھی

اتنا ہی حسین ہے یا سکین قزلباش۔“

”حسین ہے۔“ حمید نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا نہیں ہے؟“ کلرک آہستہ آہستہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

”ہٹاؤ یا ر..... مجھے تو یا سکین کے نام پر ہمیشہ لفٹھلین کی گولیاں یاد آ جاتی ہیں۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ کلرک نے بڑے خلوص سے تشویش ظاہر کی۔

دفعتاً پروفیسر کی لڑکی موتی دکھائی دی جو تیزی سے اُسی طرف آرہی تھی۔ نہ صرف حمید

نے بلکہ کاؤنٹر کلرک نے بھی خاموش اختیار کر لی۔ وہ ان کے قریب پہنچ کر رکی اور باری باری

سے دونوں کی طرف دیکھا۔

”پروفیسر اب کیسے ہیں..... کچھ بولے۔“ حمید نے پوچھا۔

”پہلے سے بہتر ہیں۔ لیکن خاموش۔ میرے کمرے میں خوب گرم کافی بھجوائے اور فون

ٹھیک کرائے۔ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے خواہ مخواہ دوڑ کر نیچے آنا پڑا۔“

”یہ تو بہت بُری بات ہے۔“ حمید نے کاؤنٹر کلرک کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ کافی بھی بھجواتا ہوں۔“

”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلفی سے فرمائیے۔“ حمید نے مونی سے کہا۔

”شکریہ۔ فی الحال کچھ نہیں۔ آپ کا کمرہ بھی تو غالباً اسی لائن میں ہے۔ اگر ضرورت

ہوئی تو ضرور تکلیف دوں گی۔“

حمید نے اس واقعے کے متعلق فوری طور پر پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ چلی گئی۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد حمید اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔

دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ اُسے توقع تھی کہ لڑکی ضرور آئے گی۔

تھوڑی ہی دیر بعد باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور کوئی کمرے کے سامنے ہی رُکا۔

دروازے میں پردہ لٹک رہا تھا اس لئے حمید اُسے دیکھ نہ سکا۔

”آ جاؤ..... میں موجود ہوں۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

پردہ ہٹا۔ لیکن ساتھ ہی حمید کو بھی اچھل کر کھڑا ہو جانا پڑا..... وہ مونی نہیں تھی۔ ایک قد

آور مرد تھا خونخوار آنکھوں والا۔ پردہ ہٹا کر بڑے اطمینان سے کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا مطلب.....؟“ حمید اسے نیچے سے اوپر تک گھورتا ہوا بولا۔

”تمہاری اجازت سے آیا ہوں..... اس لئے کسی جھگڑے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیا

تم کسی کے منتظر تھے۔“

”لیکن اس کرم فرمائی کا مطلب۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔“

”بس اتنا کہنے آیا تھا کہ لڑکی۔۔۔ دور ہی رہنا۔“

”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو۔“

”مونا چنگیزی..... پروفیسر ندیم چنگیزی کی لڑکی۔“

”میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔“

”حالانکہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تم کاؤنٹر کے قریب اس سے گفتگو کرتے رہے تھے اور

شاید تم نے یہ شام بھی اسی کے ساتھ گزاری تھی۔“

”اچھا وہ..... تمہارا بہت شکریہ۔“ حمید خوش ہو کر بولا۔ ”بڑا پیارا نام ہے۔ اس نے مجھے

اپنا نام نہیں بتایا تھا۔“

آنے والے نے اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”سنجیدگی اختیار کرو۔ ورنہ

تمہاری لاش تک کا پتہ نہ چلے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اس طرح تو کفن کے پیسے بھی بچیں گے اور میں اُن کے

پرائز بانڈ خرید لوں گا۔“ حمید نے زہریلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ویسے وہ محسوس کر رہا تھا کہ

آنے والے نے دل ہی دل میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کیا ہے۔

پھر وہ اس کی چھلانگ کی زد پر کیسے آ جاتا۔ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹا تھا اور حملہ آور

منہ کے بل فرش پر جا گرا تھا اور دوبارہ اٹھنے ہی والا تھا کہ خود حمید نے اس پر چھلانگ لگائی۔ حملہ

آور کی پیشانی فرش سے ٹکرائی۔ اس ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز نے کمرے کی محدود فضا میں

اچھی خاصی گونج پیدا کی تھی۔

”میجر سعید۔ مجھے لوگ میجر سعید کہتے ہیں۔“ حمید اُسے فرش پر رگڑتا ہوا بولا۔ اس کی گردن

میں قینچی ڈال دی تھی اور مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا۔ حملہ آور کی پیشانی فرش ہی سے لگی رہی۔

مرنے والا

پھر فرش سے ٹکرانے کا عمل جاری ہی تھا کہ حمید نے مونا کی آواز سنی۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔“

”یقیناً.....!“ حمید نے اس بار زیادہ قوت صرف کی تھی۔ مغلوب کی قوت مدافعت اچانک ختم ہو گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔

”یہ..... یہ..... کک..... کیا ہو رہا ہے؟“ مونا کی آواز اس بار قریب سے آئی تھی۔ حمید اپنے شکار کو چھوڑ کر ہٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ لیکن حمید کا خیال تھا کہ اُس نے مصلحتاً ہاتھ پیر ڈال دیئے ہیں۔

مونا حیرت اور خوف کے زیر اثر کھڑی کانپتی رہی۔

”تم..... تم.....!“ اس کی زبان سے اس کے علاوہ اور کچھ نہ نکل سکا۔

”فکر نہ کرو۔“ حمید نے جھک کر بے ہوش آدمی کو چت کرتے ہوئے کہا۔

اُس نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ لڑکھڑاتی ہوئی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ خوفزدہ آنکھوں میں اعتراف شناسائی کی جھلکیاں بھی موجود تھیں۔

”یہ کون ہے؟“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”مم..... یہ..... مل..... لیکن..... یہ یہاں کیوں آیا تھا.....؟“

”دھمکی دینے کہ اگر اب میں نے تم سے ملنے کی کوشش کی تو میرا سر توڑ دے گا۔“

”اُوہ.....!“

”لہذا مجھے اس کے جغرافیے سے واقف ہونا چاہئے۔“

”خدا کے لئے تم چپ چاپ یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”کیوں.....؟“

”بس یونہی..... میری بات مانو۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہاں کئی آدمی ایسے ہیں جو اس کے لئے جہنم کا دہانہ کھول دیں گے۔“

”خوب.....!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”میں کہتی ہوں ہوش میں آؤ۔ فوراً چلے جاؤ یہاں سے۔“

”مناسب یہ ہے کہ اس کے ہوش میں آنے سے قبل تم ہی یہاں سے چلی جاؤ اور میری

فکر نہ کرو۔“

”میرے خدا..... میں کیا کروں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کپٹیاں تھپتھا کر بولی۔
 ”کیا تم ہماری ہلاکت کا باعث بننا چاہتے ہو۔“

”مونا..... پلینز..... گٹ آؤ۔“ حمید نے دروازے کی جانب ہاتھ ہلا کر کہا۔
 ”دیکھو..... خدا کے لئے۔“

”جاؤ۔“ وہ غصیلے لہجے میں کہہ کر اُس کی طرف جھپٹا۔ مونا بوکھلا کر دروازے کی جانب مڑ گئی۔

پھر اُس کے باہر نکل جانے پر حمید نے دروازہ بند کیا اور چٹختی چڑھادی۔
 ویسے یہ احساس اب بھی ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا کہ وہ راہداری میں عین دروازے کے سامنے ہی رک گئی ہے۔

اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور بیہوش آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 جامہ تلاشی کے نتیجے میں ایک بھرا ہوا ریوالور اور ایک پرس اُس کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ پرس میں معمولی رقم اور کچھ کاغذات تھے۔

حمید اس کے دوبارہ ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔
 ریوالور گود میں رکھے بیٹھا سوچ رہا تھا کوئی خطرناک کھیل معلوم ہوتا ہے۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں چاہتے کہ بوڑھے کو طبی امداد مل سکے۔ پہلے منیجر نے دھمکیاں دی تھیں پھر کاؤنٹر کلرک اسی مسئلے پر بڑی لاپرواہی سے گفتگو کرتا رہا تھا اور اب یہ۔
 بیہوش آدمی نے کراہ کر کروٹ بدلی تھی۔ حمید نے ریوالور سنبھال لیا۔ جس کا رخ اس کی طرف تھا۔

اجنبی کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔

یک بیک وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

حمید ریوالور کی نال کلائی پر رکھے اُسے گھورے جا رہا تھا۔

”میں تمہیں اس کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی سکتا ہوں۔“ اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ اجنبی چپ چاپ اٹھا اور میز کے قریب والی کرسی پر جا بیٹھا۔
حمید نے کہنا شروع کیا۔ ”میں قطعی نہیں جانتا کہ وہ لڑکی کون ہے یہ بھی نہیں جانتا کہ تم سے اس کا کیا تعلق ہے۔ سر شام میں نے ایک زخمی آدمی کو دیکھا تھا جسے دو آدمی سہارا دے کر یہاں لائے تھے۔ لڑکی اس وقت میری ہی میز پر تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس کا باپ تھا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ اجنبی بھی خاموشی سے اُسے گھورتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں حمید کے چہرے سے ہٹ کر ریوالور کی نال پر جا ٹھہرتیں۔
”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ حمید تھوڑی دیر بعد پھر بولا۔ ”یہاں کے لوگ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ بوڑھے کو میڈیکل ایڈ ملے۔“

”میرے لئے یہ ایک بالکل ہی نئی اطلاع ہے۔“ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔

”کیا تمہیں منیجر نے میرے خلاف نہیں اکسایا۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اُسے اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ اس ہوٹل کا منیجر ہے۔“

”پھر تم مجھ پر کیوں چڑھ دوڑے۔“

”میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مرد مونا سے قریب ہونے کی کوشش کرے۔“

”اور اس کے لئے تم اس حد تک بھی جاسکتے ہو۔“

”یقیناً.....!“

”لیکن اگر اس کا باپ مر رہا ہو تو اس کیلئے طبی امداد تک فراہم کرنے کے روادار نہیں۔“

”مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ میں نے صرف اتنا سنا تھا کہ وہ واپس آ گیا ہے۔“

”کہاں سے واپس آ گیا ہے؟“

”پتہ نہیں۔ تین دن پہلے کہیں باہر گیا تھا۔“

”کیا وہ تمہیں جانتا ہے۔“

”نہیں..... وہ مجھے نہیں جانتا۔“

”تو تم اُسے مر جانے دو گے۔“

”میں کچھ بھی نہیں جانتا اس بارے میں۔ اگر میں اس کے لئے کچھ کرنا بھی چاہوں تو مونا اس پر تیار نہیں ہوگی۔ وہ مجھ سے بے انداز نفرت کرتی ہے۔“

”یہ کیوں.....؟“

”یہی دستور ہے دنیا کا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”جنہیں اپنا چاہو وہ دور بھاگتے ہیں جن کی پرواہ نہ کرو وہ سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے ہیں۔“

”ہوں..... اُوں.....!“ حمید نے سر کو جنبش دی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”میں اُس وقت سے اس کے پیچھے ہوں جب وہ صرف دس سال کی تھی۔“

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ حمید بولا۔ ”ایسی کیفیت میں زندگی گزارنے والے شہید کہلاتے ہیں۔ اگر اسی کیفیت میں شادی بھی ہو جائے تو جو رو کے غلام کہلانے لگتے ہیں۔“

”تم آخر ہو کون.....؟“ اجنبی نے حمید کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”سعید..... میجر سعید کہلاتا ہوں۔ نہ ابھی تک شہادت کے درجے پر فائز ہو سکا ہوں اور نہ ڈومیسٹک کمیشن ہی لیا ہے..... لہذا.....!“

ویسے تم کوئی شریف ہی آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بعض مجبوریاں اکثر بُرا بھی بنا دیتی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”نصیر آباد کے معزز ترین آدمیوں میں میرا شمار ہے۔ عام طور پر لوگ میرے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں لیکن اس فعل پر میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“

”کس فعل پر.....!“

”یہی مونا والا معاملہ.....!“

”پروفیسر سے شادی کی درخواست کرو۔“

”لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ متنفر ہے مجھ سے۔ اوہ میرے خدا..... تم نے مجھ کو بتایا تھا

کہ پروفیسر کو طبی امداد کی ضرورت ہے..... اور کچھ لوگ اس میں حارج ہو رہے ہیں۔“

”یہاں کا منیجر.....!“

”مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ لاؤ میرا ریوالور واپس کر دو۔ وہ غیر قانونی طور پر نہیں رکھا گیا

ہے۔ میرے پاس..... اوہ..... میرا پرس بھی۔“

وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ حمید نے پرس اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

”گن لو اپنی رقم.....!“

لیکن اُس نے اُسے ہاتھوں پر روک کر جائزہ لئے بغیر جبب میں ڈال لیا۔

حمید سوچ رہا تھا کہ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا ہے۔ ہر چند کہ ریوالور کا رخ اب بھی اُسی کی طرف تھا۔

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ریوالور ہال میں پہنچ کر تمہارے حوالے

کر دوں گا۔“

”میں بہت بُرا ہوں۔ لیکن کیونہ تو نہیں.....!“ اجنبی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہوا

بولا۔

حمید اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

نیچے پہنچ کر اس نے ریوالور اُسے واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا اب تم منیجر کے کمرے

میں چلو گے۔“

”نہیں! اُس سے پہلے میں کسی ڈاکٹر کو لاؤں گا۔ منیجر سے بعد میں پتوں گا۔“

”اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ کئی خطرناک قسم کے شہری میری راہ میں حائل ہوں

گے۔ اگر میں نے پروفیسر کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی۔“

”خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔“ اجنبی غرایا۔ ”آؤ..... میرے ساتھ۔“

پھر وہ تیزی سے منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

منیجر اپنے کمرے میں تہاٹا۔ ایرانی مصنفہ یاسمین قزلباش یاسمین کی دانست میں رضیہ اب وہاں نہیں تھی۔

اجنبی اور منیجر ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر منیجر کی نظر حمید پر پڑی اور اُس نے کھکار کر پوچھا۔ ”فرمائیے..... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”پروفیسر ندیم چنگیزی کیلئے میڈیکل ایڈ کیوں نہیں فراہم کی گئی۔“ اجنبی نے تیز لہجہ میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ.....!“

”سٹ اپ..... میں اپنی بات کا جواب چاہتا ہوں۔“

”میں اس کا پابند نہیں ہوں۔ ہوٹل کا انتظام میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ سمجھو جناب۔ اگر آپ کو ہمدردی ہے پروفیسر سے تو جائیے اور کیجئے میڈیکل ایڈ کا انتظام۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش بھی آیا ہے تو وہ ہوٹل کی حدود سے باہر..... میرے فرائض کی حدود سے دور۔ پروفیسر کی لڑکی چاہتی تو خود ہی میڈیکل ایڈ حاصل کر سکتی تھی۔ سب مجھ ہی سے پوچھنے دوڑے آتے ہیں۔ جہنم میں گیا پروفیسر اور اس کے معاملات۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم نے انہیں دھمکی دی تھی۔“ اجنبی نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ضرور دی تھی۔ کیونکہ انہوں نے یہاں بیٹھی ہوئی ایک معزز خاتون کے لئے کچھ نازیبا

الفاظ استعمال کئے تھے۔“

”برجستہ جھوٹ..... خدا کے غضب سے ڈرو۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”اگر وہ خاتون اردو سمجھ سکتی ہو تو بتاتا۔“

”تم مجھ سے گفتگو کرو۔“ اجنبی پھر غرایا۔

”جناب..... آپ کا لہجہ۔“

”اچھی بات ہے۔ اب پولیس ہی تم سے سب کچھ پوچھ لے گی۔“
 ”میں کہتا ہوں آخر.....!“ یک بیک نیجر کے چہرے سے احساس بے بسی کا اظہار ہونے لگا۔

”میں جو کچھ بھی کہتا ہوں کر گزرتا ہوں۔“
 ”اچھی بات ہے۔ ضرور پولیس کی مدد حاصل کیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں جا کر پروفیسر کی لڑکی سے بات کیجئے۔ اس کی موجودگی میں مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں کچھ کر سکوں۔“
 ”اچھی بات ہے۔ میجر سعید۔“ اجنبی نے حمید سے کہا۔ ”آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“

”یہاں..... یعنی نیجر کے آفس میں۔“
 ”جی ہاں..... میں اس معاملے کو سمجھنا چاہتا ہوں۔“
 وہ باہر چلا گیا۔ حمید اور نیجر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
 ”میں بری الذمہ ہوں پیارے۔“ حمید کچھ دیر بعد مسکرا کر بولا ”اس آدمی کا تو میں نام تک نہیں جانتا۔“

”میں سب سمجھتا ہوں۔“
 ”کیا سمجھتے ہیں۔“
 ”آپ سب مل کر میری زندگی کے خواہاں ہو گئے ہیں۔“
 ”تو آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔“
 ”پتہ نہیں۔ یہ بوڑھا مرد وہیں کیوں آ رہا ہے۔ میں کثیر العیال اور دل کا مریض ہوں۔ خدا رحم کرے میرے حال پر۔“

”جب یہ بات ہے تو اس قسم کی ذمہ داریاں کیوں لیتے ہیں اپنے سر۔“ حمید نے بڑے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ بس اندھیرے میں ایک تیر پھیکا تھا اس توقع پر کہ نتیجہ کار آمد ہی ثابت ہوگا۔
 نیجر چند لمحے ہانپتا رہا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”تین سال پہلے کی بات ہے

یہ بوڑھا پہلی بار یہاں آیا تھا۔ جس رات آیا تھا اُسی رات کو کچھ لوگ زبردستی مجھے ہوٹل کی کپاؤنڈ میں اٹھا لے گئے تھے۔ جہاں لے گئے تھے وہاں ایک سیاہ پوش پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے ایک بڑا سا چاقو نکالا اور کہا کہ میں اس بوڑھے پروفیسر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لوں۔ جب بھی وہ فزوارو میں قیام کرنا چاہے مجھے اس کے لئے کمرہ مہیا کرنا ہی پڑے گا۔ خواہ ہوٹل کے اسٹاف ہی کے کسی آدمی کا کمرہ کیوں نہ خالی کرانا پڑے۔ پھر بڑی بڑی دھمکیوں کے ساتھ دوسری ہدایت ملی تھی۔“

منیجر خاموش ہو کر ہلپنے لگا۔ حمید اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ منیجر جھوٹ نہیں بول رہا۔

”دوسری ہدایت کیا تھی۔“ اُس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہی جو میرے لئے پھانسی کا پھندہ بن گئی ہے۔ یعنی اگر بوڑھے کو کوئی حادثہ پیش آئے تو حتی الامکان اُسے پولیس سے دور ہی رکھا جائے۔ یا حتیٰ کہ میڈیکل ایڈ بھی اُس وقت مہیا کی جائے جب پروفیسر یا اس کی بیٹی خود اس کی خواہش ظاہر کریں۔ اس سلسلے میں جو بھی اخراجات ہوں ان کا حساب الگ رکھا جائے۔ ادائیگی پائی پائی کا حساب کر کے دی جائے گی اور میں بھگت رہا ہوں۔ بھگت رہا ہوں۔ پتہ نہیں کب تک بھگتنا پڑے۔“

”ایک بار اس نے دھمکیاں دیاں اور آپ تین سال سے وہی سب کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔“

”جی نہیں۔ بوڑھے کے دوران قیام میں اکثر وہ سامنے آتا رہتا ہے۔ ابھی پچھلی رات ہی میری خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح دروازے کے قفل تک کھول لیتا ہے۔“

”ہوں.....!“ حمید کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”کیا اُس نے یہ کہا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا نہ جائے۔“

”یقیناً کہا تھا۔ لیکن میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب میں کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔ میرے خدا کیسی بھیانک زندگی ہے۔ کیسی بھیانک زندگی ہے اور وہ ایرانی عورت۔ میں اُس سے بہت زیادہ خائف ہوں۔“

”کیوں..... اُس سے کیوں خائف ہیں۔“

”بے حد بڑے اسرار معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُسی سیاہ پوش سے کسی قسم کا تعلق ضرور رکھتی ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ میں کیا کروں..... میں کیا کروں۔“

حمید نے محسوس کیا کہ اب اُسے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا۔ پورا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔

”آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ حمید نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”ہے تو..... لیکن میں کیا کروں؟“

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔“

”مجھے پھر اُسی طرح اٹھوالے جائے گا اور اذیتیں دے کر ہلاک کر دے گا۔ یہی نہیں بلکہ

میرے خاندان والے بھی اُس کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔“

”یہی دھمکی دی تھی اُس نے۔“

”جی ہاں۔“

”تب میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ آرام کیجئے۔ میں ساری رات آپ کے کمرے کی نگرانی کروں گا۔“

”لیکن میرے خاندان کے دوسرے افراد شہر میں رہتے ہیں اُن کا کیا ہوگا۔“

”ارے تو اُسے معلوم ہی کیسے ہوگا کہ آپ یہ سب کچھ مجھے بتا چکے ہیں۔“

”لیکن وہ صاحب تو پروفیسر کے لئے ڈاکٹر لانے گئے ہیں۔ اُس کا کوئی تجربہ اُس تک اس

کی اطلاع پہنچا دے گا۔“

”خیر اس کے لئے بھی کچھ کر لیا جائے گا۔ ویسے آخر یہ بوڑھا پروفیسر ہے کیا بلا۔“

”خدا اُسے غارت کرے۔ یقین کیجئے آج تک اس سے زیادہ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔

ضروری باتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔“

”ہمیشہ سردیوں میں آتا ہے۔“

”جی ہاں۔“ فیجر نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ذرا آہستہ بولئے۔“

”دروازہ بند کر دوں.....!“ حمید نے پوچھا۔

”نن..... نہیں..... کھلا رہنے دیجئے۔“

”میری موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھئے۔ میں بھی ایک ماہر نشانہ باز ہوں۔ فوجی ہوں۔“

”میرے مرنے کے بعد آپ نے دس لاشیں گرا بھی دیں تو کیا۔“

”خیر..... کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ بوڑھا سردیوں میں یہاں کیوں آتا ہے۔“

”میں قطعاً کچھ نہیں جانتا۔ خدا کے لئے اب اس تذکرے کو ختم کر کے مجھے سوچنے دیجئے

کہ اب کیا ہوگا۔“

”سوچئے۔“ حمید نے بے بسی سے کہا۔

فیجر تھوڑی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا پھر بولا۔ ”آخر میں کیا سوچوں۔ میرے سوچنے

سے کیا ہوگا۔ وہ یقیناً میرے خاندان والوں کو پریشان کرے گا۔ مجھے مار ڈالے گا۔ بے حد

خوفناک آدمی ہے۔ آواز ہے اُس کی یا شیر کی دھاڑ۔ خدا کی پناہ۔ وہ جب بھی یاد آتا ہے اُس

کی آواز کانوں میں ضرور گونجتی ہے۔“

”آپ تو مجھے بھی دہلائے دے رہے ہیں جناب۔“ حمید نے کہا۔

فیجر ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہی اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی

اور بھی تھا۔ چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لٹکائے ہوئے۔

”میں ڈاکٹر لے آیا ہوں۔“ اُس نے حمید سے کہا۔ ”لیکن میرا جانا مناسب نہیں۔ تم لے

جاؤ۔ لیکن وہاں ٹھہرو گے نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے کرسی سے اٹھتے ہوئے طویل سانس لی اور ڈاکٹر سے بولا۔

”میرے ساتھ آئیے جناب۔“

پروفیسر کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ حمید نے دستک دی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ پردہ ہٹا

اور مونا کا خوفزدہ چہرہ نظر آیا۔

”تم.....!“ اُس نے سرگوشی کی۔ ”کیوں..... لیکن کیوں؟“

”ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔ اپنے ڈیڈی کو دکھائیے۔“ حمید نے کہا اور ڈاکٹر کیلئے راستہ

چھوڑنا ہوا بولا۔ ”کچھ دیر ضرور ہوگی لیکن یہی مناسب رہے گا کہ آپ اپنا اطمینان کر لیں۔“

اُس نے لڑکی کے چہرے پر اطمینان کے آثار دیکھے۔

”میری موجودگی ضروری نہیں؟“ حمید نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”میں وہیں نیجر کے آفس میں

آپ کا منتظر رہوں گا۔“

پھر لڑکی نے شاید کچھ کہنے ہی کے لئے ہونٹ ہلائے تھے لیکن آواز نہیں نکلی تھی۔

”سب ٹھیک ہے۔“ حمید ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”شب بخیر۔“

”وہ پھر نیجر کے کمرے میں واپس آ گیا۔ اجنبی وہیں موجود تھا۔ اُس نے سوالیہ نظروں

سے حمید کی طرف دیکھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹر کو وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“ حمید بولا۔

”شکریہ۔“ اجنبی نے کہا اور سامنے والی دیوار پر نظر جمائے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ حمید

نے نیجر کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ہونٹوں پر

چڑیاں سی نظر آنے لگی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تھوک نکلنے کی ”ٹرچ“ صاف سنائی دیتی۔

”اب آپ لوگ بھی آرام فرمائیں۔“ اُس نے یک بیک بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آرام.....!“ حمید نے حیرت سے کہا اور اجنبی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی نیجر کی طرف

متوجہ ہو گیا تھا۔

”میں ڈاکٹر کی واپسی کا منتظر ہوں۔“ اُس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو پھر آپ ضرور آرام کیجئے۔“ اجنبی کا لہجہ زہریلا تھا۔ ”غالباً آپ ڈاکٹر کی رپورٹ

نہیں سننا چاہتے۔“

”میں کیوں نہ سننا چاہوں گا۔“ نیجر کی آواز میں جھلاہٹ بھی تھی اور بے بسی بھی۔

اجنبی نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

حمید نے فی الحال کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے خاموش ہی رہا۔ ویسے وہ محسوس کر رہا تھا کہ فیجر کوچ مچ آرام کی ضرورت ہے۔

”ہم ہال میں بھی ڈاکٹر کا انتظار کر سکتے ہیں۔“ حمید نے اجنبی سے کہا۔

”نہیں..... یہیں کریں گے۔ مجھے یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ آخر یہ سب ہوا کیوں؟“

فیجر نے پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگل کر رہ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس شریف آدمی کو کوچ مچ آرام کی ضرورت ہے۔“ حمید نے کہا۔

اجنبی جواب دینے کی بجائے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

”کیوں.....؟“ اجنبی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”حالت مندوش ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”چند لمبے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔“ آپ

لوگوں نے بہت دیر کر دی۔ غیر معمولی طور پر خون ضائع ہوا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

انہیں آپ سنٹرل ہسپتال لے جائیں۔“

”ساتم نے.....!“ اجنبی فیجر کی طرف مڑ کر دھاڑا۔

اور وہ غریب کرسی سمیت الٹے الٹے پچا۔

”جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کیجئے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”کہئے تو میں یہیں سے ایسولینس گاڑی

کے لئے فون کر دوں۔ جلد سے جلد ہسپتال لے جائیے۔“

”یقیناً فون کر دیجئے۔“ اجنبی نے فیجر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اب میں دیکھتا ہوں کہ تم

کس طرح جواب دہی کرتے ہو۔“

فیجر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ جسم کا ریشہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔

ڈاکٹر فون پر نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

حمید محسوس کر رہا تھا کہ اب شاید خود فیجر کو بھی طبی امداد کی ضرورت پیش آ جائے۔ ہوا بھی

یہی۔ ڈاکٹر ماوتھ پیس میں ایبولینس کے لئے کہہ رہا تھا کہ فیجر کا سر کرسی کی پشت گاہ سے ڈھلک گیا۔ دونوں ہاتھ ادھر ادھر جھول گئے۔

”اب اسے بھی دیکھئے۔“ حمید نے پرسکون لہجے میں ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

”یہ..... یہ کیا مطلب.....!“ ریسور کریڈل پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر کا ہاتھ کانپ گیا۔ پھر وہ جھپٹ کر فیجر کے قریب پہنچا۔

”میرے خدا.....!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ تو..... یہ تو ختم ہو گیا۔“

”کیا.....؟“ اجنبی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”سڈن ہارٹ فیلیور.....!“

”پپ..... پھر کیا ہوگا.....؟“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا اور ہاتھ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔

اجنبی اور حمید خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ پھر حمید ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہوا۔ قریبی پولیس اسٹیشن کے نمبر اسے یاد تھے۔ رابطہ قائم ہونے میں دیر نہ لگی۔

”بوڑھے کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔“ اجنبی جلدی سے بولا۔ ”ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

حمید نے سر کو جنبش دی اور فیجر کے فیلیور کے بارے میں کہتا رہا۔

اجنبی اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ حمید ریسور رکھ کر اس کی طرف مڑا۔

”کیوں.....؟“ اُس نے پوچھا۔ ”بوڑھے کے متعلق بھی بتا دینے میں کیا حرج تھا۔“

”پھر تمہیں یہ بھی بتانا پڑتا کہ بوڑھے کے متعلق اتنی دیر میں کیوں اطلاع دی گئی۔“

”تو تم بوڑھے کو ہسپتال پہنچاؤ گے۔“

”اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔“

”ہسپتال والے پولیس کے علم میں لائے بغیر داخل نہ کریں گے کیونکہ وہ زخمی ہے۔“

حمید نے کہا۔ ”اور پھر یہ ڈاکٹر.....!“

”اس ڈاکٹر کو میں دیکھ لوں گا۔“

”جیسا مناسب سمجھو۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور وہ فیجر کی طرف دیکھنے لگا۔ مرنے کے بعد اُس کے چہرے پر خوفزدگی کے آثار صاف پڑھے جاسکتے تھے۔ حمید نے اس کے خاندان والوں کے لئے ہمدردی محسوس کی اور سوچنے لگا کیا یہاں اُس کی موجودگی ان واقعات سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ اتفاقاً پیش آیا ہے۔

”آخر یہ اس طرح مریکوں گیا؟“ اجنبی کچھ دیر بعد بڑبڑایا۔

”اسی پر تو مجھے بھی حیرت ہے۔ پروفیسر کے لئے میڈیکل ایڈ کی مخالفت کرتا رہا۔ میڈیکل ایڈ آئی تو اس حد تک احتجاج کیا کہ دنیا ہی سے چلا گیا۔“

”مخالفت کی کوئی وجہ بھی بتائی تھی۔“

”کچھ بھی نہیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں یہی تو معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ لیکن سب بے سود۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ اجنبی نے سر کو جنبش دے کر کہا۔

لیکن حمید نے اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نہ دیکھے۔

کشمکش

دوسرے دن گیارہ بجے تک پروفیسر ندیم چنگیزی کو ہوش نہیں آیا تھا۔ ہسپتال میں اسے مسلسل آکسیجن دی جا رہی تھی۔ اُسے جنرل وارڈ میں رکھا گیا تھا اور مونا کو وہاں اس کے پاس رہنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔

حمید سے ٹکرانے والا اجنبی ہر وقت ہسپتال ہی کے کسی نہ کسی حصے میں دیکھا جاتا۔ حمید بھی

وہیں تھا۔ لیکن اس نے کوشش کی تھی کہ اجنبی کی نظر اُس پر نہ پڑنے پائے۔

ہوٹل کے منیجر کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روک لی گئی تھی۔ اُس کے سلسلے میں پولیس نے ہوٹل میں بہت ہی سخت قسم کی پوچھ گچھ کی تھی۔ یاسمین تزلباش بھی اس سے بچی نہ رہ سکی۔ کسی نے کہہ دیا ہوگا کہ وہ زیادہ تر منیجر کے آفس میں دیکھی جاتی رہی تھی۔ بہر حال پولیس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جانے سے قبل کوئی بھی ہوٹل کی رہائش ترک نہ کرے۔

پروفیسر ندیم چنگیزی کے بارے میں ابھی تک کوئی سوال نہیں اٹھا تھا۔ وہ ایک بہت زیادہ بیمار آدمی کی حیثیت سے ہسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ ویسے حمید کے خیال کے مطابق یہ بھی ممکن تھا کہ اس پر اسرار اجنبی نے اپنی حکمت عملی کی بناء پر کسی قسم کا شبہ پیدا نہ ہونے دیا ہو۔ ڈاکٹر نے تو پچھلی رات ہی اپنا بیان دیتے وقت پروفیسر یا اس کی علالت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اجنبی ہی کے اشارے پر ہوا ہوگا۔ ورنہ ڈاکٹر کی مومو جو دگی میں بھی منیجر سے اس مسئلے پر بحث ہو چکی تھی۔

یہ اجنبی کون ہے؟ کیا بلا ہے آخر۔ حمید سوچ رہا تھا۔ دفعتاً ایک نئے شعبے نے ذہن میں سر اُبھارا..... کہیں اجنبی بھی تو وہی مقصد نہیں رکھتا جس کے لئے منیجر کی جان گئی۔ منیجر یہی تو چاہتا تھا کہ پروفیسر کا معاملہ پولیس تک نہ پہنچ سکے اور اجنبی کی مداخلت کی بناء پر وہ ہسپتال تو پہنچ گیا تھا لیکن پولیس کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی تھی۔ تو کیا یہ اُسی سیاہ پوش کا کوئی گرگا ہو سکتا ہے۔

اسی منہج پر سوچتے ہوئے حمید نے فیصلہ کیا کہ وہ اجنبی کے علم میں لا کر مونا سے ملنے کی کوشش کرے گا۔

اور پھر جنرل وارڈ کے صدر دروازے پر دونوں کا ٹکراؤ ہو ہی گیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو۔“ اجنبی نے راستہ روکتے ہوئے کہا۔

”اندر.....!“ حمید نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”دیکھو..... مجھ سے نہ الجھو..... ورنہ پچھتاؤ گے۔“

”میں لڑکی ہی سے پروفیسر کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”اُسے ابھی ہوش نہیں آیا۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں مونا ہی سے اس کی خیریت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔“

”کیا پچھلی رات والا تلخ تجربہ یاد نہیں رہا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”پچھلی رات میں کسی قدر نشے میں تھا۔“

”اچھی بات ہے..... اب تم جب تک اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں لاؤ گے میں تمہیں نہیں

ماروں گا۔“

”خاموش رہو۔“ اجنبی کی بھوئی تن گئیں۔

”واہ پیارے۔“ حمید بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔ ”ہم کو بعض اوقات غصے پر قطعی پیار نہیں آتا۔“

”تو پھر مجھے تمہارا بھی انتظام کرنا ہی پڑے گا۔“

”تم کیا کر سکو گے میرا انتظام۔ منسٹری آف ڈیفنس نے تو یہ کیا تھا میرا انتظام کہ مجھ سے

مستعفی ہو جانے کی درخواست کی تھی۔“

”اوہو..... تو نکالے گئے تھے۔“ یک ایک اجنبی کا رویہ بدلتا محسوس ہوا۔

”جناب.....!“ حمید سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر جھکتا ہوا بولا۔

”کیوں نکالے گئے تھے۔“

”بہتری چھوٹی چھوٹی وجوہات تھیں۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے کنٹرل کی

بیوی سے عشق ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی چودھویں کے چاند میں چرنے اور بڑھیا کی بجائے میری

تصویر دیکھنے لگی تھی۔“

”خوب.....!“ وہ حمید کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوا بولا۔ ”تو اب ذریعہ معاش کیا ہے۔“

”بدمعاشی۔“

”وضاحت کرو۔“

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ حمید کا موڈ یک لخت بدل گیا۔

”کیا مطلب.....؟“

”میں مونا کے پاس جا رہا ہوں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔“

”میں یہاں جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تمہیں دیکھ لوں گا۔“ اجنبی ایک طرف ہٹا ہوا ہوا۔

حمید دروازے سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُسے بیڈ نمبر کا علم تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی جگہ پہنچ کر رکا جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ بوڑھا چت پڑا تھا۔ آکسیجن کے ملنڈر سے ربڑ کی نلکی اس کے چہرے تک آئی تھی اور اس کا سینہ معمول کے مطابق پھول پچک رہا تھا۔ مونا بستر کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے چہرے پر اضمحلال کے علاوہ اور کسی قسم کا تاثر نہیں پایا جاتا تھا۔

حمید کو دیکھ کر وہ چونک پڑی تھی اور پھر حمید کے شانے سے اُس کے عقب میں دیکھا تھا۔ ایسا کرتے وقت دیکھنے کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں سہم جانے کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔

حمید پھرتی سے مڑا اور سچ مچ اس کا خون کھولنے لگا۔ وہی اجنبی اُس سے دو یا تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

وہ پھر مونا کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں تمہارے لئے بہت دکھی ہوں مونی بتاؤ میں کیا کروں۔“

مونا کچھ نہ بولی لیکن اُس کی آنکھوں سے جھانکنے والے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”کس وقت ہوش آیا تھا پروفیسر کو۔“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

مونا نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ زبان سے پھر بھی کچھ نہ کہا.....

”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے کہو۔“ حمید نے کہا۔ اب اُس نے اجنبی کی

طرف پشت پھیر لی تھی۔

”کک..... کچھ نہیں۔“ وہ ہکلائی۔ اب بھی حمید کے شانے کے اوپر دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً حمید نے پھر اُس کی آنکھوں میں تغیر محسوس کیا اور ساتھ ہی کوئی ٹھوس چیز اس کی کمر سے آگئی۔

حمید نے مڑے بغیر نکلیوں سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ اجنبی اُس سے لگا کھڑا تھا۔
”دروازے کی طرف۔“ اجنبی سر دلچے میں بولا۔

وہ ٹھوس چیز ریوالور کی نال کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ ریوالور اجنبی کے کوٹ کی جیب میں تھا اور نال جیب ہی سے چبھوئی جا رہی تھی۔

حمید بے چون و چرا دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اس کی اور اجنبی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں تھا اور ریوالور کی نال بدستور کمر سے لگی ہوئی تھی۔

جزل وارڈ سے نکل کر انہوں نے طویل برآمدہ طے کیا۔ اسی طرح عمارت سے دور ہوتے ہوئے سڑک پر نکل آئے۔

حمید خاموش تھا اور اس کے ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جے ہوئے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد کتھی رنگ کی ایک چھوٹی سی کار کھڑی نظر آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک بھدا سا آدمی بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اُس نے سگار پھینک دیا اور تھوک کی پککاری مارتا ہوا گاڑی سے اُتر آیا۔

پھر اُن کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ اُسی نے کھولا تھا۔ حمید کو اسی طرح گاڑی میں بیٹھنا پڑا اور بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ ریوالور کی نال کا دباؤ اپنے پہلو میں محسوس کرتا رہا۔
”کیا ارادے ہیں۔“ حمید نے خود کو لا پرواہ ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”کسی ویرانے میں پہنچ کر بات کریں گے۔“ اجنبی غرایا۔

”دیکھو دوست۔“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں کہتا ہوں..... خیر جانے دو..... یہ تو مجھے دیکھنا ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اپنا مطلع نظر تو میں تم پر پہلے ہی واضح کر چکا ہوں۔“
”چپ چاپ بیٹھے رہو۔“

حمید نے پھر ہونٹ بھیجنے لے۔ اب اُسے پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ معاملہ محض رقابت سے تعلق نہیں رکھتا۔ پروفیسر بے ہوش ہے اس سے کچھ پوچھا نہیں جاسکتا۔ مونا ہی کسی قسم کی معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لہذا کسی غیر متعلق آدمی کا اس تک پہنچنا کسی نامعلوم آدمی یا خود اسی اجنبی کو پسند نہیں۔

اس کی نظر عقب نما آئینے پر پڑی۔ پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی تھیں۔ سڑک اتنی کشادہ نہیں تھی کہ گاڑیاں برابر سے چل سکتیں۔ لہذا جب بھی اس کار کی رفتار کم ہوتی پچھلی گاڑیوں کے ہارن جگھاڑنے لگتے۔

اچانک ایک دورا ہے پر پہنچ کر کار بائیں جانب مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد حمید نے یونہی بغیر ارادہ پھر عقب نما آئینے کی طرف دیکھا۔ اب بھی ایک گاڑی پیچھے نظر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک طویل سانس لی اور آنے والے لمحات کے بارے میں سوچنے لگا۔

دفعتاً پچھلی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ سڑک کسی قدر کشادہ تھی۔ اس کار کی رفتار کچھ کم ہوئی اور پچھلی گاڑی کو راستہ دینے کے لئے ایک طرف کر لیا گیا۔

دوسری گاڑی برابر سے گزری چلی گئی۔ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد اسی کار سے ہارن دینے کی ضرورت پیش آ گئی جس میں حمید سفر کر رہا تھا۔ ڈرائیور پے در پے ہارن دیتا رہا۔ لیکن اگلی گاڑی نے نہ تو راستہ ہی دیا اور نہ اس کی رفتار ہی تیز ہوئی۔

”پاگل ہو گیا ہے مردود۔“ اجنبی غرایا۔

”فائر کر دو پچھلے کسی وہیل پر۔“ حمید نے مشورہ دیا۔

”شاید یہی کرنا پڑے۔“ اجنبی نے کہا۔ پھر یک ٹپک چوٹ کر حمید کو گھورنے لگا۔

ڈرائیور نے پھر ہارن دیا لیکن بے سود۔ اگلی گاڑی پہلے ہی کے سے انداز میں چلتی رہی۔

”تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔“ حمید بولا۔

”تمہیں یہاں کتنے لوگ جانتے ہیں۔“

”تم جانتے ہو۔ مونا جانتی ہے اور تیسرا تو چل ہی بسا۔“

”اگلی گاڑی میں کون ہے؟“

”غالباً لیڈی ماؤنٹ بیٹن.....!“

”سنجیدگی اختیار کرو۔ ورنہ ٹریگر دب جائے گا۔“ اجنبی نے کہا اور حمید بائیں پہلی میں

ریوالور کی چھن کچھ اور زیادہ محسوس کرنے لگا۔

”میں نہیں جانتا۔ اور سنو..... اگر یہ سب کچھ محض مونا کی وجہ سے ہو رہا ہے تو یقین کرو

کہ میں اب اُس سے کبھی نہ ملوں گا۔“

”اب اتنی آسانی سے گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔“ اجنبی نے طنزیہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”یعنی..... کیا مطلب.....!“

”اب میں یہ دیکھوں گا کہ تم حقیقتاً کون ہو۔“

”اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا..... تمہیں تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔“ اجنبی نے کہا۔ پھر

جھلائے ہوئے لہجے میں ڈرائیور سے بولا۔ ”کھکھو..... کھکھو۔“

حمید اس بے معنی لفظ پر چونکا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ کچھ سمجھ بھی سکتا اگلی کار کے دائیں جانب ایک دھماکہ ہوا اور وہ بائیں جانب دہتی چلی گئی۔

اس کار کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کے خانے سے کوئی چیز نکال کر پھینکی تھی۔ اب وہ دوبارہ وہی کرنے جا رہا تھا۔

پھر دھماکہ ہوا لیکن اس بار اگلی گاڑی بائیں جانب دبنے کی بجائے سڑک پر آڑی ہو کر رک گئی اور ڈرائیور کی سیٹ سے کسی نے چھلانگ لگائی۔

حمید والی گاڑی کے ڈرائیور نے پورا بریک نہ لگایا ہوتا تو وہ اگلی گاڑی سے جانکرائی ہوتی۔ صرف دو فٹ کے فاصلے پر رہی تھی۔

پھر دفعتاً حمید نے محسوس کیا کہ اسکے بائیں پہلو پر اجنبی کے ریوالور کا دباؤ ختم ہو گیا ہے۔

اجنبی کار یو الور والا ہاتھ اب کھڑکی کے باہر تھا۔ اُس نے اگلی کار کے ڈرائیور کو کور کر رکھا تھا۔
حمید والی گاڑی کا ڈرائیور نیچے اتر کر اگلی کار کے ڈرائیور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یک بیک
حمید کو ہوش آ گیا اور وہ بیٹھے ہی بیٹھے اجنبی پر ٹوٹ پڑا۔ ریو الور والے ہاتھ پر خاص طور سے
دھیان دیا تھا۔ لہذا ریو الور سڑک پر جا پڑا۔

ڈرائیور دوسرے ڈرائیور کی طرف جانے کی بجائے تیر کی طرح ریو الور کی طرف جھپٹا تھا۔
لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی وہ ریو الور کو اٹھانے کے لئے جھکا ہی تھا۔ دوسری گاڑی کے
ڈرائیور کی ٹھوکر اس کی ٹھوڑی پر پڑی اور وہ چیختا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔

اور پھر نہ اٹھ سکا۔ دونوں ہاتھوں سے ٹھوڑی دبائے ہوئے پیر پختارہا۔
ادھر حمید محسوس کر رہا تھا کہ اس کا حریف بھی کمزور نہیں ہے اور اُس نے اپنے بارے میں
غلط فہمی نہیں کہا تھا کہ وہ پچھلی رات چپے ہوئے تھا۔

دفعۃً باہر سے آواز آئی۔ ”تم لوگ بھی اتر آؤ۔ ورنہ خون ہو جائے گا ایک آدھ کا۔“

حمید نے محسوس کیا کہ اجنبی ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

دوسری گاڑی کا ڈرائیور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں
حمید نے اجنبی کار یو الور بھی دیکھا۔

اُس نے اجنبی کو دکھا دیا اور وہ سڑک پر جا پڑا لیکن پھر فوراً ہی تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

حمید گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اُس نے محسوس کیا کہ دوسری گاڑی کے ڈرائیور کی توجہ اس کی
طرف تھی بھی نہیں۔ وہ تو صرف اجنبی کو کور کئے کھڑا تھا اور اجنبی کی گاڑی کا ڈرائیور تو اس طرح
سر ڈال کر پڑا تھا کہ پھر جنبش ہی نہ کی۔ یہ نہیں بیہوش ہو گیا تھا یا یونہی بنا پڑا تھا۔

”تم لوگوں نے یہ پٹانے کیوں پھینکے تھے۔“ اگلی کار کا ڈرائیور غرایا۔

یہ ایک قد آور اور توانا جسم کا آدمی تھا۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی اور
ڈرائیوروں والی وردی میں ملبوس تھا۔

”تم ہمیں راستہ کیوں نہیں دے رہے تھے۔“ اجنبی نے سخت لہجے میں کہا۔

”اس پر تم نے پٹانے پھینکے..... کیوں.....؟ اگر گاڑی کھڈ میں جا پڑتی تو۔“
 ”میں کہتا ہوں اپنی راہ لو..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ اجنبی دانت پیس کر بولا۔
 ”اب تنہا تو جاؤں گا نہیں۔ تم بھی جاؤ گے میرے ساتھ۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”میجر سعید..... پلیز.....!“ ڈرائیور نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کیا آپ نیچے اتر کر اس شریف آدمی کے ہاتھ پیر نہیں باندھیں گے۔“

حمید نیچے اتر آیا۔ وہ اُس ڈرائیور کو پہلے ہی گھورتا رہا تھا۔

”میری گاڑی سے ڈور کا لچھا نکال لیجئے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ ڈگی میں ہے۔“
 ”تو یہ سب کچھ.....!“ اجنبی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اُس کی آواز ڈرائیور کی گونجی شٹ اپ میں دب کر رہ گئی۔

حمید اگلی کار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ڈکے اٹھا کر ریشمی ڈور کی لچھی نکالی اور پھر ان کی طرف پلٹ آیا۔

”اپنے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاؤ۔“ ڈرائیور اجنبی سے کہہ رہا تھا۔
 ”یہ ناممکن ہے۔ مجھے حلوہ نہ سمجھو۔“ اجنبی غرایا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں حمید نے ڈور کا لچھا پھینک کر اس کی کپٹی پر ایک زوردار ہاتھ جڑ دیا۔ اجنبی لڑکھڑایا پھر سنہیلے نہیں پایا تھا کہ ٹھیک اُسی جگہ دوسرا ہاتھ پڑا۔
 اس بار وہ اس طرح لڑکھڑا کر گرا تھا جیسے توازن کی حس کھو بیٹھا ہو۔
 ”کافی ہے۔“ ڈرائیور ہاتھ ہلا کر بولا۔

کپٹی کی یہ ضرب کلوروفارم سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوا کرتی تھی۔
 وہ بیہوش ہو گیا۔

”بڑا سدھا ہوا ہاتھ تھا۔“ ڈرائیور بولا۔

”مرشد کا فیض ہے۔“ حمید نے کہا اور جھک کر اُس کے ہاتھ پیر باندھنے لگا۔ اجنبی کی

گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا۔

”آپ ان دونوں کو میری گاڑی تک پہنچانے میں مدد دیجئے۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”کیا ہم پہلے بھی کبھی مل چکے ہیں۔“ حمید نے ڈرائیور کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جناب نے پرورش ہی میری گود میں پائی ہے۔“ ڈرائیور کا جواب تھا۔

حمید اچھل پڑا۔ سخت غصہ آیا اپنے ڈیوٹ پن پر..... لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ میک اپ میں تو

فریدی کا پورا ڈھانچہ ہی بدل کر رہ جاتا تھا۔ نہ قد کا صحیح سراغ ملتا اور نہ تن و توش کا۔ چلنے کا

انداز تک بدل جاتا تھا۔ پھر آواز کیا پہچانی جاسکتی۔

”اوہ.....!“ حمید ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ ”تو ایک بار پھر میں چارے کے طور پر استعمال کیا

جار ہا ہوں۔“

”وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔ اگر کوئی اور گاڑی ادھر آنکلی تو زحمت ہوگی۔ لو یہ لفافہ

رکھو..... اطمینان سے دیکھنا.....!“

”ان دونوں کو میری گاڑی تک پہنچاؤ اور تمہیں اسی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ جہاں

سے اس پر بیٹھے تھے وہیں چھوڑ دینا۔“

پھر بیہوش ڈرائیور کے ہاتھ ہیر بھی باندھے گئے اور ان دونوں کو فریدی کی گاڑی کی پچھلی

سیٹ پر ڈال دیا گیا۔

”آپ یہاں کب سے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”جب سے تم ہو.....!“

”میں نہیں سمجھا۔“

”ہم دونوں ایک ہی جہاز سے یہاں پہنچے تھے۔“

”میرے خدا.....!“ حمید منہ کھول کر رہ گیا۔

”بس اب جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

مجبوراً حمید کو بھی واپس ہونا پڑا۔ بہترے چھتے ہوئے سوالات گھٹ کر رہ گئے تھے۔ وہ

اس اندھا دھند بھاگ دوڑ کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اچانک وہ لفافہ یاد آیا لیکن وہ راستے میں نہیں رکنا چاہتا تھا۔

ہسپتال کے قریب پہنچ کر رفتار کم کر دی۔ فریدی کی ہدایت کے مطابق گاڑی کو ٹھیک اسی جگہ چھوڑنا چاہتا تھا جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

ہسپتال کے لان میں ایک گوشے میں بیٹھ کر اس نے لفافہ چاک کیا۔ اس میں صرف پرچہ ہی نہیں بلکہ تیر کی شکل کی ایک سنہری ٹائی پن بھی تھی۔

وہ چند لمحے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ والی تحریر دیکھنے لگا۔ رائٹنگ فریدی ہی کی تھی لکھا تھا۔

”پروفیسر کی لڑکی سے قریب تر ہونے کی کوشش جاری رکھو۔ وہ سارہ رحمان کو بہت قریب سے جانتی تھی۔ فی الحال ایک نامعلوم آدمی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اجنبی اس لڑکی سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ پروفیسر میرے لئے نئی دریافت ہے۔ اسے بھی دیکھنا پڑے گا۔ یہ ٹائی پن ہر وقت تمہارے استعمال میں رہنا چاہئے۔ اگر غیر متوقع حالات سامنے آئیں تو حیرت کا اظہار نہ ہونا چاہئے۔ وقتاً فوقتاً تمہیں ہدایات ملتی رہیں گی۔“

حمید نے پرچے کا پرزہ پرزہ کر کے ایک طرف اچھال دیا اور ٹائی پن کو پھر گھورنے لگا۔ سنہرا تیر..... اوہ..... گولڈن ایرو..... تو اب اُسے اس نشانی سمیت منظر عام پر آنا پڑے گا۔ یعنی وہ خود کو اُسی گروہ سے متعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا۔

”سارہ رحمان۔“ وہ بڑبڑایا اور ایک طویل سانس لے کر خلاء میں گھورنے لگا۔ عرفان آرٹسٹ کا معصوم چہرہ یاد آیا..... وہ قاتلہ یاد آئی جس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایک خطرناک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ جسے افسوس تھا کہ اس کی وجہ سے ایک معصوم آدمی کو پولیس نے جیل میں ڈال رکھا ہے۔ وہ جس نے اپنا گمشدہ پرس حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے معصوم آدمی کو آلہ کار بنایا تھا۔ وہ جو فریدی سے ملنا چاہتی تھی اور اسی دھوکے میں اپنے انجام کو پہنچی تھی کہ وہ فریدی سے ملنے جا رہی تھی۔

اُس کا پرس یاد آیا جو اب بھی فریدی کے پاس تھا۔ لیکن کیا تھا اُس پرس میں۔ ایک معمولی سی رقم جس کی گشہدگی ایک مفلس ترین آدمی کے لئے بھی اتنی باعث تشویش نہ ہوتی کہ وہ اُسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کا خطرہ مول لے بیٹھتا۔

اگر اُس پرس کی اہمیت تیر کے نشان کی وجہ سے تھی تو یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں۔ گولڈن ایرو کا نام اُن دنوں اسی طرح مشہور تھا جیسے عالمی تنظیم مافیا کے بارے میں دنیا کا ہر آدمی کسی قدر معلومات ضرور رکھتا ہے۔

”اونہہ.....!“ اُس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ کچھ دیر بعد چونکا۔ ٹائی پن اب بھی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا ٹائی پن ٹائی سے نکال کر جیب میں ڈال لیا اور اس کی جگہ لفافے سے برآمد ہونے والا پن لگاتے ہوئے سوچا اگر مونا اس کی اہمیت سے واقف ہے تو اب وہ اُس سے بھی دور بھاگے گی۔ جیسے اُس اجنبی سے کتراتے ہی تھی۔ کتنی خوفزدہ نظر آتی تھی اُس کی موجودگی میں۔

پائپ کا تمباکو راکھ ہو چکا تھا۔ حمید نے فیصلہ کیا کہ وہ مونا کی موجودگی میں تیر نما ٹائی پن استعمال نہیں کرے گا۔

پائپ کی راکھ جھاڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ پھر جزل وارڈ کی طرف جا رہا تھا۔ مونا اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل بھی حمید نے اُسے دیکھا تھا۔ اتنی بُری حالت تو نہیں تھی۔ اب تو ایسا لگتا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

”تت..... تم..... واپس آ گئے۔“ وہ بدقت ہکلائی۔

”مظلوموں کی حمایت اور حفاظت کرنا ہمیشہ سے میرا اصول رہا ہے۔“

”مظلوموں..... کیا مطلب.....!“ وہ خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں نے اس دوران میں بہت کچھ محسوس کیا ہے۔“

”کک..... کیا محسوس کیا ہے۔“

”یہی کہ تم خائف ہو۔ مجھے اس آدمی کے بارے میں بتاؤ جو مجھے یہاں سے لے گیا تھا۔“

”وہ..... وہ کہاں ہے..... وہ.....!“

”تم نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کسی چوہے کی طرح اُس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔“

”مم..... میں نے محسوس کیا تھا۔“

”وہ مجھے ریوالور کے زور پر یہاں سے لے گیا تھا۔“

”میں نے یہی محسوس کیا تھا۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”پھر کیا ہوا۔“

”تین سو فٹ گہری کھڈ اس کا مقدر بن گئی۔“

”کک..... کیا..... کک..... کیسے.....!“

”اُس نے مجھ پر گولی چلائی تھی..... تین فائر کئے تھے۔ پھر میں نے اُسے اٹھا کر کھڈ میں

پھینک دیا۔“

”اب کیا ہوگا..... میرے خدا.....!“ اُس نے کہا اور آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے

جھولنے لگی۔

”اے..... ہوش میں آؤ۔“ حمید نے اُس کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ بالکل اسی طرح چونک پڑی تھی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔

”تت..... تم نے اُسے مار ڈالا.....!“

”ہاں..... میں ہر اس آدمی کو مار ڈالوں گا جو تیر کی شکل کا ٹائی پن استعمال کرتا ہو۔“

”خ..... خدا کے لئے آہستہ بولو.....!“ وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی گڑ گڑائی۔

حمید نے تقہیبی انداز میں سر کو جنبش دی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”تت تم کیوں مار ڈالو گے ہر اس آدمی کو.....!“

”میں اپنی اس معصوم دوست کی موت کو کبھی نہیں بھلا سکتا جس کے پہلو میں ایک زہریلا

تیر پیوست ہو گیا تھا۔ میرے خدا وہ کتنی اچھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کے جال سے نکلنا چاہا تھا

اور انہوں نے اُسے مار ڈالا۔“

”تم کس کی باتیں کر رہے ہو۔“ مونا ہانپتی ہوئی بولی۔

”تھی ایک لڑکی..... بہر حال میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے ایک ایسا آدمی میرے ہاتھ لگا جو گولڈن ایرو بطور ٹائی پن استعمال کرتا تھا۔“

”مم..... میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”تم سمجھ کر کیا کرو گی۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ لیکن تم اس سے متنفر ہو اور وہ تمہیں اتنا زیادہ چاہتا ہے کہ تمہارے قریب کسی دوسرے مرد کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”سب کو اس تھی۔“ وہ بے ساختہ بولی اور پھر خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”پھر.....!“ حمید نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اُسے تم سے کس قسم کا

لگاؤ تھا۔“

”میں نہیں جانتی..... میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی۔

”تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ تم بھی انہیں لوگوں سے تعلق رکھتی ہو۔“

”نہیں..... نہیں..... ہرگز نہیں۔“ وہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتی ہوئی بولی۔

”خیر..... خیر..... تم بہت پریشان ہو۔ میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ لیکن سارہ کے

قاتل اب مجھ سے نہیں بچ سکتے۔“

”سارہ.....!“ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”س..... سارہ رحمان تو نہیں۔“

”کیا.....؟ کیا تم اُسے جانتی تھیں۔“ حمید نے حیرت ظاہر کرنے کی بہت شاندار اداکاری کی۔

وہ پھر بیٹھ گئی اور کسی بت کی طرح ویران ویران آنکھوں سے خلاء میں گھورے جاری تھی۔

وہ غار

دوسری صبح حمید الجھن میں تھا کہ فریدی کو اُن واقعات سے کیسے آگاہ کرے جو پچھلے دن

پیش آئے تھے۔

ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے ناشتے کے لئے فون کیا اور کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ سردی پچھلے دن سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وینر ناشتے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ اور حمید پائپ میں تمباکو بھرتا ہوا میز کے قریب آ بیٹھا۔ پچھلے دن کے واقعات اب بھی اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

تمباکو بھر کر پائپ ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ناشتے کی ٹرے پر نظر ڈالی اور سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑ لئے۔

چاکلیٹ کا پیکٹ..... اُس سے پہلے تو کبھی ناشتے کے ساتھ چاکلیٹ کا پیکٹ نہیں آیا تھا۔ اُس نے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پر تفکر انداز میں اُس پر سے کور اتارنے لگا۔ یہ اس نے کسی خاص خیال کے تحت نہیں کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں پیکٹ کی اہمیت اُس پر واضح ہو گئی۔ کور کی چٹائی سطح پر سیاہ روشنائی سے تحریر تھا۔

”ناشتہ کر کے لباس تبدیل کرو۔ پارکنگ شیڈ میں گہرے براؤن رنگ کی ایک ٹوسیٹر جس کا نمبر ایم پی اے سات سو گیارہ ہے تمہارے ہی لئے مہیا کی گئی ہے۔ چابی ڈیش بورڈ کے خانے میں ہے۔ بس سیدھے بھر تو نالے کی طرف چلے آؤ اور ہاں وہ ٹائی پن لگانا مت بھولنا۔“ حمید نے طویل سانس لی اور کور کو پرزے کر کے آتش دان میں ڈال دیا۔ تو جناب نے پوری طرح جال بچھا رکھا ہے۔ اُس نے سوچا..... اور ناشتے کی ٹرے کی طرف پھر متوجہ ہو گیا۔ کافی فلیور نہ جانے کیوں اچھا نہ لگا۔ سینڈوچ اچھے تھے..... جوں توں ناشتہ ختم کر کے لباس تبدیل کیا۔

ٹوسیٹر جس کا تذکرہ پیغام میں تھا پارکنگ شیڈ میں موجود تھی۔ حمید نے اُسے دیکھتے ہی محسوس کیا کہ وہ غیر معمولی ساخت رکھتی ہے۔

ڈیش بورڈ میں گاڑی کی کتاب اور کتیاں موجود تھیں۔ کتاب کھول کر دیکھی تو بھونچکا رہ گیا۔ یہ میجر حامد سعید ہی کے نام کی تھی۔ پتہ رام گڈھ زون کے بل اسٹیشن کا تھا۔

اُس نے کنجی کے لچھے سے انگیشن کی منتخب کی اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے پارکنگ شیڈ سے نکال لایا۔

اب وہ بھرنالے کی طرف جا رہا تھا۔

نالہ کہلاتا تھا لیکن حقیقتاً تھا ایک انتہائی پر شور پہاڑی دریا، جو رام گڈھ اور ٹیکم گڈھ کے درمیان خط تقسیم کا کام بھی دیتا تھا۔

میلوں تک بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اسے پار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہی سڑک جس پر حمید سفر کر رہا تھا ایک جگہ پل پر سے گزرتی ہوئی ٹیکم گڈھ کی سرحد میں داخل ہوتی تھی۔

حمید سوچ رہا تھا کیا اسے پل تک جانا ہوگا۔ ویسے سڑک تو کئی جگہ بھرتو نالے کے قریب سے بھی گزرتی تھی۔

”اونہہ.....!“ وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ ”دیکھا جائے گا۔“

لیکن یہ کنجیوں کا لچھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انگیشن اور گاڑی کے دوسرے قفلوں کے لئے عموماً ایک ہی کنجی ہوتی ہے پھر یہ سات عدد کنجیاں کیسی ہیں جن کی بناوٹوں میں بھی نمایاں فرق ہے۔

کار تیز رفتاری سے پہاڑی سڑک طے کرتی رہی۔ ابر ہونے کی وجہ سے خشکی بڑھ گئی تھی۔ غنیمت یہی تھا کہ ہوا تیز نہیں تھی۔ ورنہ ڈرائیوگ وبال جان بن جاتی۔ پھر بھی ہاتھوں پر دستانے تو تھے ہی ورنہ ٹھنڈے اسٹیرنگ نے ہتھیلیوں کا خون منجمد کر دیا تھا۔

اُسے پھر کنجیوں کا خیال آیا۔ اُس نے سوچا کہ رکنا چاہئے کسی مناسب سے مقام پر اور دیکھنا چاہئے کہ کہیں ”یہ حجرہ ہائے ہفت بلا“ کی کنجیاں تو نہیں ہیں۔

سات عدد کنجیاں طلسم ہوشربا کے سات حجروں کی کنجیاں بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق فادر ہارڈ اسٹون سے ہے۔ فادر ہارڈ اسٹون جو اپنی جسامت اور قد و قامت تک بدل کر رکھ دیتا ہے۔

خدا کی پناہ..... پچھلے دن آنکھوں نے کیسا دھوکا کھایا تھا۔

اُس نے ایک جگہ سڑک کے کنارے تھوڑا سا مسطح ٹکڑا دیکھ کر گاڑی وہیں روک دی اور ڈیش بورڈ کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔

پھر گاڑی کے دوسرے حصوں کی طرف متوجہ ہوا۔

دروازے کچھ غیر معمولی سے لگے اُن کی موٹائی غیر معمولی تھی۔ ویسے بھی جب حمید نے اس گاڑی کو پارکنگ شیڈ میں دیکھا تھا تو ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس موجود تھا کہ وہ عام ٹو سیٹر گاڑیوں سے مختلف ہے۔

دروازہ کھولنے کے لئے ہینڈل گھمایا ہی تھا کہ ہینڈل کے نیچے ایک مخصوص کٹاؤ والی غلاء نظر آئی۔

”ہوں.....!“ اُس نے تقریبی انداز میں سر کو جنبش دی اور اس غلاء میں مختلف کنجیاں فٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر ایک لگ ہی گئی اور اسی دروازے کا اسٹرکھل کر سیٹ پر آ پڑا۔ اسٹر کے پیچھے ایک ٹائٹ قسم کا خانہ تھا جس میں ایک ٹائی گن رکھی ہوئی تھی اور اس کے لئے چار راؤنڈ بھی تھے۔ حمید نے فوراً ہی اسٹر اس کی جگہ لگا کر اُسے دوبارہ مقفل کر دیا۔

پھر وہ دوسرے دروازوں کو بھی آزمانے ہی جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی قریب سے گزر گئی۔ پھر چند ثانیوں کے بعد دوسری بھی گزری لیکن اس بار حمید کو الارٹ ہو جانا پڑا۔ اس گاڑی کو یاسمین قزلباش ڈرائیو کر رہی تھی اور تہا تھی۔

حمید نے اپنی گاڑی بھی اسٹارٹ کی اور اسی رفتار سے چل پڑا جس رفتار سے یاسمین کی گاڑی گزری تھی۔

دونوں گاڑیوں کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ سو گز رہا ہوگا۔ حمید نے دیدہ و دانستہ یہ فاصلہ برقرار رکھا اور نہ چاہتا تو اُس سے اور بھی قریب رہ سکتا تھا۔

پھر یک بیک ایک موڑ پر اگلی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بہت ہی خطرناک قسم کا موڑ تھا۔ حمید کو رفتار بہت کم کر دینی پڑی۔ ذرا سی بے احتیاطی گاڑی کو سیکڑوں فٹ گہری کھڈ

میں لے جاتی۔ لیکن وہ عورت..... یاسمین قزلباش یا تو پاگل تھی یا خود اعتمادی کے معاملے میں جواب نہیں رکھتی تھی۔

موڑ تک پہنچتے پہنچتے حمید کی گاڑی ریٹکنے لگی تھی۔ بہت احتیاط سے اس نے نصف دائرہ پورا کیا اور پھر کشادہ سڑک پر پہنچ گیا۔ لیکن حد نظر تک یاسمین کی گاڑی کا پتہ نہیں تھا۔ حمید نے گیسر بدل کر ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ لیکن پھر تو انجن ہی بند کر دینا پڑا تھا۔ بڑی گہری ڈھلان تھی۔ شاید یہ ڈھلان حمید کی یادداشت سے محو ہو گئی تھی۔ ورنہ وہ اس موڑ سے گزر جانے کے بعد بھی رفتار کا اعتدال قائم رکھتا۔ اس کے بعد پھر چڑھائی تھی۔ سلف لگا کر انجن دوبارہ اشارت کیا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد کچھ فاصلے پر اُسے دو گاڑیاں نظر آئیں ایک سڑک پر آڑی کھڑی تھی اچھا دوسری سیدھی۔ یہ یاسمین ہی کی گاڑی تھی۔ لیکن وہ جو آڑی کھڑی تھی صاف ظاہر ہوتا تھا جیسے اُسی کو روکنے کے لئے وہ اُس پوزیشن میں لائی گئی ہو۔

حمید نے بھی قریب ہی پہنچ کر گاڑی روکی۔ یاسمین والی گاڑی خالی تھی۔ لیکن اگلی گاڑی کے قریب ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔

”معاف فرمائیے گا جناب۔“ اس آدمی نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں ایک منٹ میں آپ کیلئے راستہ بناتا ہوں۔ پکنک کیلئے نکلنے والے عمو! اپنے دماغ گھر ہی چھوڑ آتے ہیں۔“ ”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ حمید گاڑی سے اترتا ہوا بولا۔

”شکریہ۔“ دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ کافی جگہ ہے صرف گاڑی کی پوزیشن بدلی پڑے گی۔

حمید اتنی دیر میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ دوسرے آدمی کی نظر اُس کی ٹائی پن پر ہے۔ پھر اُس نے حمید کے لئے پر سوالیہ نظر ڈالی۔

حمید نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”بائیں جانب.....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”راستہ بنا ہوا ہے۔“

”یہ گاڑی سیدھی کرلو۔ خواہ مخواہ..... لوگ شبہات میں مبتلا ہوں گے۔“ حمید بڑبڑاتا ہوا گاڑی کے پاس سے ہٹ گیا۔

دوسرا آدمی انجن اشارت کر کے گاڑی کی پوزیشن تبدیل کرنے لگا۔ حمید نے اُس کی ٹائی میں تیر نماپن دیکھا۔

بائیں ڈھلان پر ایک پتلی سی اور کسی قدر گہری نالی نظر آئی۔ اُس نے سوچا غالباً اسی پگڈنڈی کو اُس نے راستہ کہا تھا اور یقیناً یہ راستہ کسی خاص جگہ تک جاتا ہوگا۔ اس نالی کی گہرائی ایک یا ڈیڑھ بالشت سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ لیکن یہ انسانی ہاتھوں کا کارنامہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

حمید اُسی نالی کے سہارے ڈھلان میں اترتا رہا۔ ایک جگہ وہ نالی پہاڑی سڑک ہی کی طرح گھومی ہوئی نظر آئی اور اُس موڑ سے گزرتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ شاید تحت المٹری ہی میں اس کا اختتام ہو کیونکہ آگے پھر موڑ تھا۔

ایسے ہی تین موڑ اور ملے اور پھر وہ گہری پگڈنڈی ایک غار میں داخل ہوگئی۔ پگڈنڈی داخل ہوگئی ہوگی۔ حمید تو دہانے ہی پر ٹھک گیا تھا۔

پھر ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک گمر کی اوٹ سے ایک ریوالور نکل کر اسکے سینے سے آگیا۔ ”سامنے آؤ.....!“ حمید غرایا۔

ریوالور گمر کی اوٹ سے باہر آگیا۔ حمید نے پہلے اُسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے نالی پن کی طرف دیکھنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ گڑبڑا کر بڑبڑایا اور ریوالور کی نالی حمید کے سینے سے ہٹ گئی۔

”راستہ دکھاؤ..... میں دھام نگر سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔“ حمید بولا۔

”آئیے..... آئیے..... ایک منٹ یہاں ٹھہریے تاکہ آنکھیں اندھیرے کی عادی

ہو جائیں۔“

”ساری رات جاگتا رہا ہوں.....!“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”ہوسکتا ہے مجھے تمہارے

سہارے کی بھی ضرورت ہو۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ مجھے سہارا دے کروہاں تک پہنچاؤ۔“

”کیا کوئی نیا حکم ہے۔“

”یقیناً..... ورنہ مجھے بھی کیوں آنا پڑتا اور پھر یہی نہیں یہ حکم بھی حالات کا رخ معلوم

کرنے کے بعد ہی تم تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ورنہ میں یونہی واپس جاؤں گا۔“

”بہتر ہے..... آئیے.....!“ اُس نے حمید کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دور چلنے کے بعد حمید کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔

”میں نہیں سمجھ سکتا۔“ حمید کا ساتھی بڑبڑا رہا تھا۔ ”اب کیا حکم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی سنئے

کہ ہمارے پاس ایک شکار بھی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”فزارو میں ٹھہری ہوئی ایک ایرانی لڑکی..... جو ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔“

”خوب..... ہاں..... فزارو میں ہے ایک لڑکی..... میں نام نہیں جانتا۔“ حمید سر کھجاتا ہوا

بولا۔ ”میرا قیام بھی وہیں ہے۔“

”ادھ تو آپ..... لیکن آپ ہسپتال میں تو نہیں تھے۔“

”بتایا تا کہ میں پچھلی رات دھام نگر طلب کر لیا گیا تھا.....!“ حمید نے کہا اور سوچ میں

پڑ گیا کہ آخر اس نے ہسپتال کا حوالہ کیوں دیا؟ انہیں اس کا علم تھا کہ پچھلے دن وہ اجنبی ہسپتال

میں بیہوش پروفیسر اور اس کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ لیکن شاید یہ آدمی اُس اجنبی کو صورت سے نہیں

پچچانتا ورنہ ہسپتال کا نام نہ لیتا۔

بہر حال حمید اس کے ساتھ چلتا رہا۔ زیادہ دور نہیں چلا تھا لیکن راستہ اتنا دشوار گزار تھا کہ

مسافت کی طوالت کا احساس ہوتا تھا۔

اور پھر ایک جگہ تیز روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ چٹان کے کسی رخسہ سے غالباً پیرو میکس لیمپ کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

حمید نے سوچا ممکن ہے وہاں کوئی ایسا لے جائے جو اُس اجنبی کو پہچانتا رہا ہو۔ دیکھا جائے گا۔ اس کے زیرِ بغل ہولسٹر میں بھرا ہوا ریو الور موجود تھا۔

دو عدد پیرو میکس لیمپوں سے غار کا یہ حصہ پوری طرح روشن تھا۔

حمید مونا چنگیزی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ دو آدمیوں کے درمیان سبھی کھڑی تھی اور تیسرے نے یاسمین قزلباش کا بازو پکڑ رکھا تھا۔

حمید کی آمد پر وہ سب ہی چونکے تھے۔ لیکن دونوں لڑکیوں کے چہروں کے تاثرات ان سے مختلف تھے۔ مونا نے متحیرانہ انداز میں منہ کھولا تھا اور پھر بند کر لیا تھا۔ یاسمین کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی تھی۔

گہرے سنائے کو توڑتے ہوئے حمید نے کہا: ”آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں۔“
تینوں نے سوالیہ انداز میں اُس آدمی کی طرف دیکھا جو حمید کو یہاں تک لایا تھا۔ ”یہ کوئی نیا حکم لائے ہیں۔“ اس نے جمائی لے کر کہا۔

”اور وہ حکم حالات کے تحت ہے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں۔“
وہ کوشش کر رہا تھا کہ مونا سے نظر نہ ملنے پائے۔

”ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ اُس نے منبر سعید نامی آدمی کو کیا بتایا ہے۔“ اُن میں سے ایک بولا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر اس نے نہ بتایا تو میں تم تک دوسرا حکم پہنچا دوں گا۔“ حمید نے جیب سے پائپ اور تمباکو کی پاؤچ نکالی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یاسمین اُسے عجیب نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔

”اور یہ ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔“ دوسرے نے یاسمین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”خاصی ہے۔ اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”تم.....!“ دفعتاً ایک آدمی اس کی طرف مڑا۔ ”تم کون ہو؟“

”کیا یہ سوال ضابطے کے مطابق ہے۔“ حمید غرایا۔

”اور اظہار خیال کا یہ انداز کہاں تک درست ہے۔“

”خیر..... خیر..... یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔“

مونا نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور چہرے پر اندرونی کشمکش کے آثار تھے۔

”یہ کچھ نہیں بتاتی۔“

”بتائے گی۔“ حمید نے پائپ اور پاؤچ کو دوبارہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور بغل کے

نیچے ہاتھ لے جا کر ریو الور نکال لیا۔

”بتاؤ..... تم نے میجر سعید کو کیا بتایا تھا۔“ حمید نے ریو الور کا رخ مونا کی طرف کرتے

ہوئے کہا اور پھر فار بھی کر دیا۔

وہ چیخ مار کر لہرائی اور ادھر ادھر کھڑے ہوئے آدمیوں نے اُسے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔

”یہ..... یہ..... کیا.....!“ تیسرا آدمی ہکھلایا۔

”خاموش رہو.....!“ حمید کا لہجہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ پھر کسی کے حلق سے آواز نہ نکلی۔ مونا کی

آنکھیں بند تھیں اور وہ آگے پیچھے جھول رہی تھی۔

گولی کا گزر اُس کے سر سے کئی انچ اونچائی سے ہوا تھا۔

”سیدھی کھڑی کرو..... نشانہ خطا ہوا۔“ حمید زور سے دھاڑا اور مونا نے آنکھیں کھول

دیں۔ حمید کہہ رہا تھا۔ ”اس بار دل کا نشانہ لوں گا جو کبھی خطا نہیں کرتا..... بتاؤ..... تم نے میجر

سعید کو کیا بتایا تھا۔“

”مم..... میں نے۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ”یہی بتایا تھا کہ میرے ڈیڈی سنگی ہیں۔ ہر

سال سردیوں میں یہاں آتے ہیں مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر کئی کئی دن غائب رہتے ہیں۔ لیکن

مجھے نہیں بتاتے کہ وہ اُن دنوں کہاں غائب رہتے ہیں۔“

”اور کیا بتایا تھا.....؟“

”اور کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی تو نہیں..... رحم کرو میرے حال پر۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید نے ریو الور والا ہاتھ جھکاتے ہوئے کہا اور پھر فاتحانہ انداز میں اُن چاروں کی طرف دیکھ کر بائیں ہاتھ سے جیب میں پڑے ہوئے پائپ کو نٹو لئے لگا۔

”اس طرح تو ہم بھی.....!“ ایک بولا۔

”معتل چاہئے..... کام کرنے کیلئے..... خیر... اب میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

اُن چاروں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ اب حمید یا سمین کی طرف متوجہ نظر آنے لگا۔ اس نے انگریزی میں مخاطب کیا۔

”میں نے تمہیں فزارو میں دیکھا تھا۔“

”ہاں میں وہیں مقیم ہوں.....!“ غصیلی آواز میں جواب ملا۔

”ان لوگوں کا تعاقب کیوں کیا تھا۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تم لوگوں کا۔ میں تعاقب کیوں کرنے لگی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ تم مصنفہ ہو۔“

”تم نے غلط نہیں سنا۔ نہایت غصے کے عالم میں جواب دیا گیا۔“

”ایرانی ادب میں جمود تو نہیں ہوا.....!“

”جمود..... جمود کیوں ہوتا ہے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔ ہمارے یہاں تو بالکل ہو گیا ہے۔ عالم یہ ہے کہ آج کل

بڑے بڑے شاعر اور انشاء پرداز خواتین کے ساتھ بیٹھے آلو چھلا کرتے ہیں۔“

”تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ مجھے جانے دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ سب اچھا ہی اچھا ہوگا۔ لیکن ایک بات ہے ان لوگوں سے جو

غلطی ہوئی ہے اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کرنا۔ محض اس لئے تمہارے ساتھ یہ رعایت ہے کہ تم

غیر ملکی ہو اور تمہیں ہمارے معاملات سے سروکار نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مقامی آدمی کو ہم نے غلطی

سے بھی اس طرح روکا ہوتا تو زندہ واپس نہ جانے دیتے۔“

یا مین ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

”تم نے بھی مجھے فزارو میں دیکھا ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”مجھے دھیان نہیں۔“

”اور آئندہ بھی دیکھو گی۔ لیکن تمہاری زبان بند ہونی چاہئے۔ اس تکلیف دہی کے سلسلے

میں ہم تمہاری خدمت میں کوئی بڑا تحفہ پیش کریں گے۔“

”مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ وہ برا سامنہ بنا کر بولی۔

”تنت..... تو آپ انہیں لے جائیں گے۔“ ایک آدمی نے پوچھا۔ حمید جواب میں کچھ

کہنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی غار کے دہانے کی طرف سے انکے سامنے آگرا۔ پھر وہ اٹھ ہی رہا

تھا کہ حمید نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے سڑک پر اُسے اس غار کا راستہ بتایا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی ایک گونجیلی آواز سنائی دی۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

ایک دراز قد آدمی دہانے کے قریب ٹامی گن سنبھالے کھڑا تھا۔

حمید کے ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر اوپر اٹھتے چلے گئے۔ ریوالور تو وہ پہلے ہی ہولٹر میں

رکھ چکا تھا۔

”میجر سعید کے علاوہ اور سب اپنے ہاتھ گرا دیں۔“

حمید نے سوچا شاید یہ بھی اُسے نہیں پہچانتا۔ اس لئے یہ نفسیاتی طریقہ اختیار کیا۔ لہذا

سب کے ساتھ ہی اُس نے بھی اپنے ہاتھ گرا دیئے۔

”میجر سعید.....!“ ٹامی گن والا غرایا۔

حمید اب بھی دوسروں ہی کی طرح انجان بنا کھڑا رہا۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ کیا تم نے سنا نہیں۔“ اس بار اُس نے خاص طور پر حمید کی

طرف ٹامی گن کی نال گھمادی۔

”گھاس تو نہیں کھا گئے۔“ حمید نے جی کڑا کر کہا۔

”میں تم لوگوں سے کہہ رہا ہوں کہ یہ میجر سعید ہے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو۔“

”تم کون ہو۔“ اُن میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔

”میں تم ہی میں سے ایک ہوں۔“

”لہلہ..... لیکن..... یہ بھی تو..... ٹائی پن.....!“

”سب فراڈ ہے۔ تم اسے باندھ لو۔ کیوں لڑکی۔ بتاؤ یہ کون ہے ورنہ تمہارا جسم چھلنی ہو کر رہ جائے گا۔“ اُس نے مونا کو مخاطب کیا۔

”مم..... میں نہیں جانتی۔“

”تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ میجر سعید ہے۔“

مونا کچھ نہ بولی۔ اب وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ حمید کے فائر پر بھی اس کے چہرے پر اتنی مردنی نہیں چھائی تھی۔

”بتاؤ..... ورنہ ٹریگر پر دباؤ ڈالتا ہوں۔“ وہ پھر غرایا۔ اب ٹائی گن کا رخ مونا ہی کی طرف تھا۔

مونا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”دیکھو.....!“ اُس نے دوسروں سے کہا اور وہ حمید پر ٹوٹ پڑے۔

”نہیں..... احتیاط سے..... صرف باندھ لینا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ کون ہے۔ اے

میجر سعید..... ہوش میں آؤ..... ورنہ ہمیشہ کے لئے اپنا ج ہو جاؤ گے۔“

یاسمین کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ لیکن وہ دم بخود کھڑی رہی۔ مونا بُری طرح

کانپ رہی تھی۔ ذرا ہی سی دیر میں انہوں نے حمید کے ہاتھ پیر ٹائیوں سے باندھ دیئے۔

”اب تم سب میرے ساتھ چلو گے..... اوہ..... یہ..... دوسری لڑکی کون ہے۔“ ٹائی گن

والے نے پوچھا۔

”یہ ایک ایرانی سیاح ہے..... فزارو میں ٹھہری ہوئی ہے اس نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔“

”کیوں.....؟ تم نے ان کا تعاقب کیا تھا۔“

”پتہ نہیں۔ تم کیا پوچھ رہے ہو۔“ یاسمین نے انگریزی میں کہا۔ ”میں تمہاری زبان نہیں سمجھتی۔“

”کیا تم نے ان لوگوں کا تعاقب کیا تھا۔“ اس بار اس نے انگریزی میں سوال کیا۔

”یہ سراسر بکواس ہے۔ میں یہاں بغرض تفریح آئی ہوں۔ ایک گاڑی کرائے پر حاصل کی ہے اور ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہوں۔ آج اتفاقاً ادھر نکل آئی تھی۔ میرے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوا ہے۔ میں اپنے سفارتخانے سے شکایت کروں گی۔“

”اگر تم مجھے اطمینان دلا سکیں کہ تم سچ مچ غیر ملکی ہو تو ہم تمہیں جانے دیں گے ورنہ پھر ہمیں سوچنا پڑے گا۔“

”میرا پاسپورٹ گاڑی میں موجود ہے۔“

”اچھی بات ہے یہ بھی دیکھ لیں گے۔“ ٹامی گن والے نے کہا پھر دوسروں سے بولا۔
”اسے اٹھا کر گاڑی تک لے چلو۔“

اشارہ حمید کی طرف تھا۔

دس منٹ بعد وہ سڑک پر تھے۔ گاڑیوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ ٹامی گن والے نے انہیں ہدایت دی تھی کہ وہ حمید کو اس کی گاڑی میں ڈال دیں۔ پھر اُس نے یاسمین سے پاسپورٹ طلب کیا تھا۔

حمید اُس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا سوچ رہا تھا شاید یہ آخری سفر ثابت ہو۔ مونا کو وہ ساتھ ہی لے جا رہا تھا۔ پتہ نہیں اب کن لوگوں سے سابقہ پڑے۔ یہ آدمی اُسے پہچانتا تھا ورنہ وہ اُن دونوں کو تو لے ہی نکالتا تھا۔

دفعۃً اس نے اسی آدمی کی آواز سنی۔ ”لڑکی کو میری گاڑی میں بٹھا دو۔“

پھر اس نے دیکھا کہ مونا اگلی سیٹ پر بیٹھ رہی ہے۔

”تم سب میرے پیچھے آؤ۔“ اسی آدمی نے دوسروں سے کہا۔

”لیکن جناب آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ واپس پہنچ کر پولیس کو اطلاع دے گی۔“

کسی نے پوچھا۔

”جہنم میں جائے جتنی دیر میں وہ پولیس تک پہنچے گی ہم نہ جانے کہاں ہوں گے۔ چلو

بیٹھوا اپنی گاڑی میں..... اور ہاں ایک آدمی میجر سعید کی گاڑی کو سنبھالے گا۔“

پھر حمید نے اُسے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھتے دیکھا۔ انجن اشارت ہونے کی آواز آئی اور گاڑی چل پڑی۔

عقب نما آئینہ ونڈا سکرین کے اوپر لگا ہوا تھا۔ حمید اس میں پیچھے آنے والی دونوں گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ تیسری یا سیمین کی گاڑی کہیں نہ دکھائی دی۔

حمید مونا کا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ بار بار مڑ کر اُس کی طرف دیکھتی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی غم آلود نرمی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی غلطی پر نادم ہو۔

”تم دونوں اگر چاہو تو گفتگو بھی کر سکتے ہو۔“ ڈرائیو کرنے والا دفعتاً بولا اور حمید کی کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ سخت غصہ آیا۔ دل چاہا کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالے کیونکہ یہ فریدی ہی کی آواز تھی۔

حمید کو وہ رگڑے اور گھسے یاد آئے جو ان لوگوں نے اُسے باندھتے وقت دیئے تھے۔

”ارے..... تم کچھ بول نہیں رہے میجر سعید۔ حالانکہ بہت خوش مزاج مشہور ہو۔“

”میجر سعید کی ایسی کی تیسری..... میں نہیں سمجھ سکتا۔“ وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

”خفگی کی وجہ برخوردار.....!“

”کیا میں گدھا ہوں۔“ حمید نے حلق پھاڑنے کی کوشش کی لیکن غصے کی زیادتی کی بناء پر

اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

”گدھے تو ہو لیکن اچھی نسل کے.....!“

”میں مونا کو نکال لاتا.....!“ حمید نے بدستور خوشگوار لہجے کو برقرار رکھا۔

”تم صرف مونا کو نکال لاتے..... اور میں ان پانچوں کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

عقل استعمال کرنا سیکھو فرزند..... اگر ہم انہیں باندھ لیتے تو کتنی مشقت برداشت کرنی پڑتی۔

اپنی پشت پر لا کر اتنی چڑھائی طے کر کے سڑک تک پہنچنا پڑتا۔ پھر ڈرائیو کرنے والے ہم دو ہی

ہوتے اور گاڑیاں تین تھیں۔ ظاہر ہے کہ سڑک پر کوئی گاڑی چھوڑی نہ جاسکتی۔ خواہ مخواہ سنسنی

بھیلتی اس سے۔ بہر حال تم خود ہی دیکھ لو کہ وہ اپنے آپ بڑی خوشی سے موت کے منہ میں چلے آ رہے ہیں۔ تمہیں تھوڑی بہت چوٹیں ضرور کھانی پڑی ہیں..... لیکن یہ آسانی ان چوٹوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ کھوپڑی ایک بار پھر تاج گئی تھی۔ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ فادر ہارڈ اسٹون کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ سچ مچ اگر دو ایک کو بھی پیٹھ پر لا کر چڑھائی چڑھنی پڑتی تو اس وقت وہ بے دم پڑا ہوتا۔

فریدی پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں اس لئے طلب کیا تھا کہ مونا سے حاصل کی ہوئی معلومات مجھ تک پہنچ سکیں۔ جب تمہیں دیر ہوئی تو خود چل پڑا۔ یہاں تمہاری گاڑی نظر آئی۔ ایک آدمی ان گاڑیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اُسے مجبور کیا کہ وہ سب کچھ اگل دے۔ اُسے راستہ دکھانے کے لئے ساتھ لے جانا پڑا۔ لیکن وہاں اُن کی تعداد دیکھ کر اسکیم ہی بدل دینی پڑی۔ خیر ہاں تو تمہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔“

”کھلنے کے بعد جائزہ لوں گا۔“ حمید برا سامنہ بنا کر بولا۔

گفتگو اردو ہی میں ہوتی رہی تھی۔ بار بار مونا کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آتے اور وہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی۔

”یہ..... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔“ وہ بالآخر ہڈیانی انداز میں بولی۔

”فکر نہ کرو..... اب کوئی پریشانی کی بات نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”میرے ڈیڈی کا کیا حال ہوگا۔ تم لوگ آخر ہو کون۔“

”میں اپنے بارے میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور یہ شخص میرا فادر ہے۔ حالانکہ عمر

میں مجھ سے تین یا چار سال سے زیادہ بڑا نہ ہوگا۔“

”مجھے ڈیڈی کے پاس پہنچا دو۔ خدا کے لئے رحم کرو۔“

”تمہارے ڈیڈی ہر طرح محفوظ ہیں۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن اگر اب تم واپس گئیں تو

تمہارا انجام بھی سارہ رحمان کے انجام سے مختلف نہ ہوگا۔“

”سارہ رحمان۔“ وہ کانپ کر رہ گئی۔

ہنسی اور دستانے

سارہ رحمن کے انجام کے حوالے پر مونا کی حالت بگڑنے لگی تھی۔

حمید نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم پر اعتماد کرو۔ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ البتہ ہسپتال واپس جانے کی صورت میں شاید تم اپنے ڈیڈی کے لئے بھی خطرہ بن جاؤ۔“

مونا کچھ نہ بولی۔ ایک بار پھر اُس کے چہرے پر زردی دوڑ گئی تھی۔ ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ گاڑی تیز رفتاری سے راستہ طے کرتی رہی۔ دفعتاً حمید کو یاسمین قزلباش یاد آئی۔

”اوہو..... آپ نے اُسے کیوں نکل جانے دیا۔“ وہ بول پڑا۔

”کس کی بات کر رہے ہو۔“

”یاسمین قزلباش کی۔“

”اوہ تو اسے کیا کرتا..... وہ ایک ایرانی ہے۔“

”جناب..... جناب..... سب سے پہلے تو یہ گزارش ہے کہ وہ ایرانی نہیں۔ قطعی طور پر

یہیں کی باشندہ ہے یہ اور بات ہے کہ وہ ایرانیوں کے سے لہجے پر قدرت رکھتی ہو۔ بہر حال

آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ بھی مونا کا تعاقب کرتی رہی ہے۔“

”نہیں.....!“ مونا اچھل پڑی۔

”یقین کرو..... میں نے دیکھا ہے۔ اس شام کو بھی وہ تمہارا تعاقب کرتی ہوئی باہر

آئی تھی۔ جب فزارو کے کچن میں آئل اسٹوو پھٹنے سے دھماکا ہوا تھا۔“

”مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“

”میں نے دیکھا تھا.....!“

”یہ تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے۔“

”اور..... دوسری بات..... نہیں بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ وہ رضیہ کے علاوہ اور کوئی نہیں

ہو سکتی۔“

”کون رضیہ.....؟“

”وہی جو ہمارے درزی خانے کی روح رواں تھی۔“

”گھاس تو نہیں کھا گئے۔“

”آپ نے وہاں اسے دیکھا تھا۔“

”نہیں۔“

”تو پھر میرے حواسِ خمسہ پر اعتماد کیجئے۔ وہ سو فیصد رضیہ ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر دیکھنا پڑے گا۔“ فریدی کے لہجے میں تشویش تھی۔ پھر اس نے

کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”تم نے اُس پر یہ تو نہیں ظاہر کیا کہ اُسے پہچانتے ہو۔“

”نہیں..... میں نے کافی احتیاط برتی ہے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ نالے کے پل کے قریب پہنچ کر انہوں نے پچھلی گاڑیوں سے

پے درپے ہارن کی آوازیں سنیں۔

”کیا قصہ ہے۔“ فریدی بڑبڑایا۔

عقب نما آئینے میں اُن دو گاڑیوں کے علاوہ اور کسی تیسری گاڑی کی جھلک بھی نہ دکھائی دی۔

فریدی نے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے لگا کر کھڑی کر دی۔

پچھلی دونوں گاڑیاں بھی رک گئی تھیں۔ ایک آدمی اتر کر فریدی کی گاڑی کے قریب آیا۔

”صاحب..... ہم یہ پل کراس نہ کر سکیں گے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں..... ہاں..... میں جانتا ہوں..... لیکن یہ میرا حکم ہے۔ باس کے لیفٹیننٹ حسب

ضرورت ان احکامات میں تبدیلیاں بھی کر سکتے ہیں۔“

”آپ جانئے۔“

”میں یہ اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہوں۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔ ”جاؤ.....!“

اس نے پھر انجن اشارٹ کیا۔ وہ آدمی گاڑی کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔

گاڑی چل پڑی۔ اُس نے بھرتوٹالے کے اس پل کو بھی پار کر لیا جو ٹیکم گڈھ اور رام گڈھ کو منسلک کرتا تھا۔ حمید عقب نما آئینے میں پچھلی گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔

”میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔“ مونا بڑبڑائی۔

”مطمئن رہو بے بی..... تم بالکل محفوظ ہو.....!“ فریدی نے کہا۔

”میں ڈیڑی کے لئے پریشان ہوں..... یہ کیسی بیہوشی ہے۔“

”میں تمہیں اطمینان سے بتاؤں گا۔ فکر نہ کرو۔ میں پروفیسر کی حفاظت کی ذمہ داری بھی

لے سکتا ہوں۔“

”آپ لوگ کون ہیں.....؟ خدا را بتائیے۔“

”کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔“ حمید بولا۔

”میں نے تو آج تک نہیں دیکھا کہ دوستی کے لئے کسی نے اتنا کچھ کیا ہو۔“

”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ بہت کچھ دیکھو گی۔“

”سنجیدگی سے گفتگو کرو میجر سعید۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تھوڑی سی عقل بھی استعمال کرو۔“

”میں کیا کروں.....؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”فی الحال خاموش رہو۔“ حمید بولا۔ ”مجھے دیکھو کتنے ممبر و سکون کے ساتھ اتنی دیر سے

بندھا پڑا ہوں۔“

گاڑیوں نے ٹیکم گڈھ میں داخل ہو کر تقریباً دو ڈھائی میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ دفعتاً

ایک جگہ فریدی نے ہاتھ باہر نکال کر پچھلی گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود بھی رفتار کم کر کے

گاڑی روک دی۔

مونا اور حمید کے علاوہ اور سب گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ یہاں کچھ عجیب سی چٹانیں تھیں اور یہ راستہ عام سڑک سے ہٹ کر تھا۔

”شکار کو اٹھا کر میرے ساتھ چلو۔“ فریدی نے شکاریوں سے کہا اور وہ حمید کو کھینچ کھانچ کر باہر نکالنے لگے۔

حمید بہت بُرے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ ”دیکھنا تم لوگ اپنا انجام..... رونا چاہو گے لیکن آنسو نہ نکلیں گے۔ چیخنا چاہو گے لیکن حلق بند ہو جائیں گے۔“

ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ فریدی مونا کا ہاتھ پکڑے دو چٹانوں کے درمیان درے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سب حمید کو کاندھوں پر اٹھائے اس کے پیچھے چلتے رہے۔

راستہ دشوار گزار تھا۔ حمید کو خدشہ تھا کہ اُن میں سے کہیں کوئی لڑکھڑا کر گر نہ پڑے۔ بہر حال وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی سلامتی کی دعائیں مانگتا ہوا ان کے کاندھوں پر سفر کرتا رہا۔ کچھ دور چلنے کے بعد فریدی نے ایک جگہ ٹھہرنے کو کہا۔

یہاں بھی ایک غار ہی سے سابقہ پڑا تھا۔ فریدی نے ٹارچ روشن کی اور وہ سب غار کے دہانے میں داخل ہو گئے۔ قدموں کی چاپوں سے گونجتا ہوا تاریک غار کچھ عجیب سا ماحول پیدا کر رہا تھا۔

لیکن یہ تاریکی جلد ہی غائب ہو گئی۔ اب وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کئی پیٹرو میکس لیمپ روشن تھیں۔ دو تین آدمی بھی پہلے سے موجود تھے۔

انہوں نے بڑے بے تعلقانہ انداز میں ان کا استقبال کیا تھا۔

حمید کو انہوں نے زمین پر ڈال دیا۔ حمید کو بے ساختہ برف کے بھوتوں کے کیس والے غار یاد آ گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں یہ بھی انہیں غاروں میں سے نہ ہوں۔ جنہیں انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا اور جہاں زمانہ قدیم میں بدھ بھکشو رہا کرتے تھے۔

یہاں گھٹن کا احساس نہیں تھا۔

دفعتاً فریدی نے انہیں لوگوں سے کہا۔ ”اب اسے کھول دو۔“

”ہمیں کتنی دیر ٹھہرنا ہوگا۔“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ ہم کتنی دیر بعد واپس جائیں گے اور یہاں کس مقصد کے تحت لائے گئے ہیں۔“

”واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

اس سوال کے جواب میں فریدی نے ٹامی گن سیدھی کر لی اور ان آدمیوں کو مخاطب کر کے بولا جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ”اب ان کے ہتھکڑیاں لگا دو۔“

ہتھکڑیوں کے نام پر کبھی چونک پڑے تھے۔

”جس نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی وہ ڈھیر ہوا۔“ فریدی نے ٹامی گن کو جنبش دے کر کہا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے ہتھکڑیاں لگ گئی تھیں۔

اب حمید بھی ان کی طرف سے اتالا پڑا وہ نظر آ رہا تھا جیسے پہلے انہیں کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہم تو نہیں سمجھ سکتے۔“ قیدیوں میں سے ایک نے کہا۔

لیکن فریدی نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”انہیں لے جاؤ۔“

کچھ دیر بعد غار کے اُس حصے میں صرف حمید فریدی اور مونا ہی رہ گئے؟

”بیٹھ جاؤ۔“ فریدی نے مونا سے کہا۔ ”تم بھوکے ہوگی۔“

مونا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”ہتھکڑیاں تو

صرف پولیس والے ہی استعمال کرتے ہیں۔“

”تم اس فکر میں نہ پڑو۔ میں پروفیسر کی حفاظت کا انتظام بھی کر چکا ہوں۔ یہ بہت اچھا

ہوا کہ تم اس طرح ہم لوگوں تک آ پہنچیں۔“

”ورنہ کیا ہوتا..... ورنہ کیا ہوتا۔“

”آپ اس بے چاری کو فی الحال آرام ہی کرنے دیجئے۔“

”کیا واقعی تم اتنی تھکن محسوس کر رہی ہو کہ میرے سوالات کے جواب نہ دے سکو۔“

فریدی نے اُس سے پوچھا۔

”نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”سارہ رحمان کے بارے میں کچھ۔“

”میں سب کچھ انہیں بتا چکی ہوں۔“ مونا نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں اپنے طور پر کچھ سوالات کروں گا۔“

”پوچھئے۔“

”تم اُسے کب سے جانتی تھیں۔“

”ہم ساتھ ہی پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ مسٹر رحمان میرے ڈیڈی کے گھرے دوستوں میں سے تھے۔ چونکہ اُن کی مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ سارہ کی تربیت پر دھیان نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسے بھی ہمارے ہی گھر بھیج دیا تھا۔ میرے ڈیڈی نے اُسے تعلیم دلوائی اور اُسے اس قابل بنایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے، اسی دوران میں مسٹر رحمان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے سارہ کے لئے معقول رقم چھوڑی تھی۔“

مونا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”اُس نے اپنا انڈسٹریل ہوم کب قائم کیا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”پانچ سال پہلے کی بات ہے۔“

”کاروبار کیسا چل رہا تھا۔“

”بہت اچھا..... نصیر آباد کے اونچے طبقے میں اُس کے یہاں کا کام بہت مقبول تھا۔“

”تم نے ان پانچ برسوں کے دوران میں کوئی خاص تغیر محسوس کیا تھا اس میں۔“

”تغیر.....!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں خلاء میں گھورتی رہی پھر

بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے اُس میں کئی قسم کے تغیرات محسوس کئے تھے۔ کاروبار شروع ہونے کے دو سال بعد تک وہ معمول کے مطابق ہی نظر آتی رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد میں نے اُسے ہمیشہ ایک اعصاب زدہ لڑکی ہی کے روپ میں دیکھا۔ ذرا سی آواز پر اس طرح

چونک پڑتی تھی جیسے قریب ہی کہیں بم گرا ہو۔“

”تم نے اُس کی وجہ ضرور پوچھی ہوگی۔“

”یقیناً..... لیکن اس نے کبھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا تھا۔“

”کیا تم سچ بول رہی ہو؟“ فریدی اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا اور وہ بوکھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ فریدی کا لہجہ خوشگوار نہیں تھا۔

”اوہ..... تو تم نے مجھے بھی کچی بات نہیں بتائی تھی۔“ حمید نے اپنے مخصوص لہجے میں شکوہ کیا۔

”میں کیا کروں..... میں کیا کروں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگی۔

”قانون کے ہاتھ مضبوط کرو۔“ فریدی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”تو کیا..... آپ لوگ.....!“

”ہاں..... ہم قانون کے محافظ ہیں۔“

”میرے ڈیڈی..... میرے ڈیڈی۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ انہیں محفوظ سمجھو۔ البتہ قدرتی موت سے تو انہیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔“

مونا کچھ نہ بولی۔ فریدی کہتا رہا۔ ”اپنے ذہن کو اُس کے لئے تیار کرو..... ورنہ کتنے ہی

اچھے لوگ سارہ کی طرح موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔“

مونا پھر بھی خاموش رہی۔

”بہتر ہوگا کہ تم کچھ دیر آرام کرو۔“ حمید نے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتی۔ بس آپ لوگ کسی طرح

مجھے ڈیڈی کے پاس پہنچا دیجئے۔“

”جب تک وہ بھیڑیا آزاد ہے یہ نہ ہو سکے گا۔“ فریدی بولا۔ ”میں تمہارا خون اپنی گردن

پر نہیں لے سکتا۔“

”پھر میں کیا کروں۔“

اس سلسلے میں جو کچھ بھی جانتی ہو من وعن مجھے بتا دو۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔“

مونا کچھ دیر تک خاموش رہی پھر بولی۔ سارہ ایک لڑکے کو چاہتی تھی۔ اس بُری طرح کہ بلا آخر وہی اُس کی تباہی کا باعث بھی بن گیا۔ اگر وہ درمیان میں نہ ہوتا تو سارہ بھی آج زندہ ہوتی۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ فریدی نے بات کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی بولی۔ ”جس زمانے میں وہ بہت زیادہ نروس نظر آنے لگی اکثر کہا کرتی تھی کہ واجد نے اُسے بہت بڑے جنجال میں پھنسا دیا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت اُس نے کبھی نہیں کی۔“

”ایک منٹ۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”واجد کون تھا.....؟“

”نصیر آباد کی کسی فرم کا پرچیز آفیسر تھا۔ فرم کا نام مجھے یاد نہیں۔ اتنا جانتی ہوں کہ وہ درآمد و برآمد کا کاروبار کرتا ہے۔“

”اُن کی دوستی انڈسٹریل ہوم قائم ہونے سے پہلے ہوئی تھی یا بعد میں۔“

”بعد میں۔“

”یہ یقین کے ساتھ کیسے کہا جاسکتا ہے۔“

”سارہ نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ اگر اُن کی دوستی پہلے ہوئی تھی تو مجھے اُس کے بارے میں کئی سال بعد کیوں بتائی۔“

”بہر حال جب سے اُس نے اپنی اُس پریشانی کا تذکرہ کیا تھا میں نے اُسے کبھی خوش نہیں دیکھا۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتی تھی۔“

”اس کے بعد سے اُن دونوں کے تعلقات میں بھی فرق آیا ہوگا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ بُری طرح جان دیتی تھی اُس پر۔ اگر کسی دن اس سے

ملاقات نہیں ہوتی تھی تو وہ پاگلوں کی طرح شہر کی گلیوں کی خاک چھانتی پھرتی تھی۔“

مونا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس اجمال کے لئے تفصیل ترتیب دے رہی ہو جسے کبھی ہوئی بات کے لئے بطور دلیل پیش کر سکے۔

”مجھے حیرت ہے۔“ حید بڑبڑایا۔ ”کم از کم میں تو کسی ایسی ہستی کا وجود برداشت نہیں

کر سکتا جو میرے لئے الجھن کا باعث بنے۔“

”آپ عورت نہیں ہیں۔“ مونا اُسے گھورتی ہوئی بولی۔

”عورتوں سے بھی بدتر۔“ فریدی بنے سگار کا گوشہ توڑتے ہوئے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے وہ خود ہی موجودہ موضوع سے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کسی عورت کی موجودگی میں تو میری توہین نہ کیجئے۔“

”تمہیں وہ عورت تو یاد ہی ہوگی فرزند جس نے تمہاری نازک کلائیوں کی شان میں قصیدہ

کہا تھا۔“

حمید سمجھ گیا تھا کہ فریدی کسی مقصد کے تحت موضوع گفتگو بدلنا چاہتا ہے۔ لیکن اُسے یہ

بات پسند نہ آئی کہ اس سلسلے میں وہ خود ہی نشانہ بنے۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ اُس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”اور وہ عورت بھی یاد ہی ہوگی جسے تمہارے شرمانے کی ادا ایسی بھائی تھی کہ وہ تمہیں اپنی

سہیلی بنانے پر آمادہ ہو گئی تھی۔“

”وہ بھی یاد ہے۔“ حمید نتھنے پھلا کر بولا۔

مونا اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”لہذا متحیر ہونا چھوڑ دو عورتوں کی باتوں پر۔“ فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔

”بہت بہتر..... بہت بہتر۔“ حمید اس طرح سر ہلا کر بولا جیسے دیر سے اس ہدایت کا منتظر

رہا ہو۔

”ہاں بے بی۔“ دفعتاً فریدی مونا کی طرف مڑ کر بولا۔ ”کیا سارہ نے اُس جنجال میں

پھنسا یا تھا پروفیسر کو۔“

”س..... سارہ..... نہیں تو۔“ مونا گڑبڑا گئی۔ ”لل..... لیکن جنجال..... ڈیڈی تو کسی جنجال۔“

”یہ کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے علم ہے کہ پروفیسر اُسے تم سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔“

”آپ..... آپ کیا جانیں۔“

”مجھے علم ہے۔ لیکن پروفیسر کا دوسرا روپ حال ہی کی دریافت ہے۔ یہاں آنے ہی پر

معلوم ہوا کہ پروفیسر بھی اس جنجال سے الگ نہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ کچھ نہیں جانتی..... خدا کے لئے مجھ سے کچھ نہ پوچھے۔“

”کیا تمہیں اپنے وطن سے محبت نہیں ہے۔“

”لیکن میں کیا جانتی ہوں جو آپ کو بتاؤں گی۔ ڈیڈی نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ ہر سال سردیوں میں ہی رام گڈھ آتے ہیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے جیسے کوئی نظر نہ آنے والا پھندا ان کی گردن میں پڑا ہوا ہے اور وہ کشاں کشاں رام گڈھ کی طرف لے جائے جا رہے ہوں۔“

”یہ بھی نہیں بتایا تمہیں کہ ایسے سخت موسم میں یہاں آنے کا کیا فائدہ۔“

”وہ کیمسٹری کے پروفیسر ہیں۔ آئے دن طرح طرح کے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ کسی ایک تجربے کے لئے انہیں کئی سال سے ایک مخصوص درجہ حرارت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تجربہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ اس لئے انہیں سردیوں میں یہاں آنا پڑتا ہے۔“

”خوب.....!“ فریدی اسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”پروفیسر نے تمہیں یہی بتایا ہے۔“

”جی ہاں۔“

”حالانکہ اس ترقی کے دور میں کوئی سا بھی درجہ حرارت حاصل کرنے کے لئے موسم یا سطح سمندر سے بلندی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا..... کیا خیال ہے تمہارا.....!“

”یہی تو میں بھی سوچتی رہی ہوں۔“

”لیکن تم نے کبھی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”میں ڈیڈی کو غصہ دلانا پسند نہیں کرتی۔ اُن کے اعصاب کمزور ہیں۔“

”ویسے تم نے یہ تو محسوس ہی کیا ہے جیسے وہ جبراً و قہراً آتے ہوں۔“

”جی ہاں..... میں یہی محسوس کرتی رہی ہوں۔“

”اچھا..... اس تجربے سے پہلے بھی کبھی تم لوگ رام گڈھ آتے رہے ہو۔“

”جی نہیں..... میری اپنی یادداشت میں تو نہیں۔“

”اب دو ایک سوالات میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔“ حمید بول پڑا۔

فریدی نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے سر کو جنبش دی اور مونا حمید کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تم اُس آدمی سے بہت زیادہ خائف تھیں۔ نہ صرف خائف تھیں بلکہ اُس کے بارے

میں خاصی معلومات بھی رکھتی تھیں۔ اُس رات جب تم نے اُسے میرے کمرے میں بیہوش پڑے

دیکھا تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ فزارو میں تنہا نہ ہوگا۔ اس کے ساتھی جہنم کا دہانہ کھول دیں گے۔“

”لیکن ڈیڑی کو اُس سے کیا سروکار۔ وہ تو شاید اُسے جانتے بھی نہ ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اُس کا تعلق تو سارہ والے معاملے سے تھا۔“

”ہوں.....!“ فریدی بولا۔ ”لیکن تم خائف تھیں۔“

”وہ..... وہ دراصل واجد کا بڑا بھائی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ واجد کے قتل میں سارہ کا

ہاتھ تھا۔“

”قتل..... کس کا قتل.....!“

”واجد کا قتل.....!“

”یہ کب کی بات ہے۔“

”آٹھ یا دس ماہ پہلے کی۔ اُسی کے بعد تو سارہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ پھر کچھ

دنوں کے بعد اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کس جنجال میں پھنسی رہی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ

واجد کو اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک درندے نے قتل کر دیا تھا۔ گردن میں چھری مار کر ایک

جھٹکا دیا تھا۔ زخروں کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور خون کی موٹی سی دھارا چھل پڑی تھی۔ میں کیا

بتاؤں کہ وہ کیسے انداز میں اس کا تذکرہ کرتی تھی۔“

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی اور پھر جھر جھری سی لے کر بولی۔ ”میں نہیں سمجھ سکتی کہ سارہ

اچانک اتنی کیوں بدل گئی تھی۔ واجد کے قتل سے پہلے وہ ایک اعصاب زدہ سی لڑکی تھی لیکن اُس

کے بعد میں نے محسوس کیا تھا جیسے اُس سے زیادہ نڈر اور فولادی قسم کی قوت فیصلہ رکھنے والی کوئی

عورت میری نظر سے گزری ہی نہ ہو۔ وہ ان لوگوں سے انتقام لینے کیلئے نکل کھڑی ہوئی تھی۔“
 ”لیکن تم واجد کے بھائی سے کیوں خائف تھیں۔“

”جب تک سارہ زندہ رہی تھی وہ اس کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اُسے مجبور کرتا رہا تھا کہ وہ اُسے واجد کے قاتل کے بارے میں بتادے پھر ایک دن سارہ کے قتل کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی اور وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ اس طرح ہمارے بنگلے کی نگرانی کرنے لگا جیسی ہم کہیں فرار ہو جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ مجھ سے کہا تھا کہ سارہ نے تمہیں ضرور بتایا ہوگا کہ واجد کو کس نے قتل کیا تھا۔ مجھے بتاؤ ورنہ میں ساری زندگی تمہارے پیچھے لگا رہوں گا۔ وہ نصیر آباد کے متمول ترین آدمیوں میں سے ہے۔ بدنام بھی ہے۔ بہت سے غنڈے پال رکھے ہیں۔ کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ چار بد معاش ساتھ ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں نے تم سے کہا تھا کہ اس سے نہ الجھو..... مجھے یقین ہے کہ وہ فرازو میں تنہا نہ رہا ہوگا۔ نصیر آباد سے میرا تعاقب کرتا ہوا رام گڈھ آیا تھا۔“
 ”پروفیسر کو علم تھا اس کا۔“

”نہیں..... میں نے اس کے بارے میں انہیں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ یونہی بہت پریشان رہتے تھے اور سارہ کے قتل کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے حواس ہی میں نہ ہوں۔“
 ”کیا وہ خائف تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بہت زیادہ..... ڈرے ڈرے سہمے سہمے..... لیکن انہوں نے کبھی اس کی وجہ نہیں بتائی۔ میں پوچھتی تھی تو یہی جواب ملتا کہ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
 ”ہوں.....!“ فریدی نے پر نظر انداز میں سر کو جنبش دی۔
 مونا خاموش ہو گئی تھی۔ حمید پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد فریدی نے پوچھا۔ ”سارہ کن لوگوں سے انتقام لینا چاہتی تھی۔“
 ”اُس نے کھل کر کبھی نہیں بتایا۔ ایک بار اپنا پرس میرے سامنے پھینک دیا تھا اور اس پر بنے ہنسنے سنہرے تیر کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی کہ ان سے.....! پھر قطعی طور پر خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ مجھے اس کے متعلق صاف طور پر بتائے۔ لیکن ایسا نہ

ہوا۔ پھر ایک بار اُس نے کہا تھا کہ میرا یہ پرس میرے لئے اپنی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ راز پوشیدہ ہے جو میرے واجد کے قاتل کو جہنم میں پہنچا دے گا۔“

فریدی جو اُسے پر تشویش نظروں سے دیکھتا رہا تھا بولا ”اور تم یہ ساری باتیں پہلی بار مجھے بتا رہی ہو۔“

”نہیں..... انہیں بھی بتائی تھیں۔“ مونا نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس کے علاوہ.....!“

”کسی کو بھی نہیں۔ حتیٰ کہ واجد کے بھائی ساجد کو بھی نہیں بتائیں۔ نہ جانے کیوں اُسے دیکھ کر مجھے غصہ آ جاتا تھا اور میں اپنے ہونٹ سی لیتی تھی۔“

”کیا یہی پرس تھا۔“ فریدی نے سارہ رحمان والا پرس جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

حمید نے اُسے بُری طرح چونکتے دیکھا۔

”یہ..... یہ..... آپ کو کہاں سے ملا..... کہاں سے ملا۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولی اور بے چینی سے فریدی کے جواب کی منتظر رہی۔

”تم اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ یہ وہی پرس ہے یا نہیں۔“

”یقیناً وہی ہے۔“ وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی بولی ”آپ کو کہاں سے ملا بتائیے مجھے۔“

”سارہ سے۔“

”اوہ..... میرے خدا..... وہ ہمدردوں کے درمیان پہنچ جانے کے بعد بھی زندہ نہ رہ سکی۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”یقیناً..... آپ اس کے ہمدردوں میں سے ہیں۔ تبھی تو اُس کے لئے.....!“

”لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ پرس..... تم ہی بتاؤ..... بھلا اس میں کیا ہے۔ جب میرے ہاتھ آیا تھا تو اس میں چند سکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔“

”جتنی بات میں نے اُس کی زبان سے سنی تھی آپ کو بتا دی۔ اس سے زیادہ اور میں

کچھ نہیں جانتی۔“

فریدی چند لمحے خلاء میں گھورتا رہا پھر بولا۔ ”واجد کے قتل کے سلسلے میں اُس نے پولیس کو تو کوئی بیان نہیں دیا تھا۔“

”یہی تو بڑی عجیب بات ہے..... اس معاملے میں اس کے بھائی ساجد کا رویہ بھی حیرت انگیز رہا ہے۔ اُس نے بھی تو پولیس کو اس سلسلے میں مطلع نہیں کیا کہ سارہ اس کے بھائی کے قتل کے متعلق کچھ جانتی ہے۔“

”خیر..... کچھ اور بتاؤ سارہ کے بارے میں..... ہاں تو اس نے قاتل کے متعلق اور کیا بتایا تھا۔“

”وہ نقاب پوش تھا..... چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی اور کچھ دستانوں کا بھی تذکرہ تھا۔ دستانوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ پاگلوں کی طرح ہنسی بھی اور بڑی حقارت سے کہا اب میرے ہاتھوں سے بچ کر کہاں جائے گا۔“

فریدی نے تقہیبی انداز میں سر کو جنبش دی۔

پہاڑ خانم

حمید پھر فزارو کی طرف واپس جا رہا تھا۔ لیکن میک اپ میں نہیں تھا۔ اب اُسے حمید بی کی حیثیت سے فزارو میں قیام کرنا تھا۔ البتہ فریدی کی ہدایت تھی کہ وہ رجسٹر میں اصل نام اور پتہ درج نہ کرائے۔

حمید سوچ رہا تھا۔ آخر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر وہ میجر سعید کے میک اپ میں اب نہیں رہ سکتا تھا پھر کوئی دوسرا روپ اختیار کرنے کی ہدایت ملی تھی۔ آخر کھل کر سامنے آ جانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

”اوہو.....!“ اُس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر سخت ہو گئے اور وہ بڑبڑایا۔ ”تو یہ بات ہے۔“

نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے وہ ونڈ اسکرین پر نظر جمائے رہا۔

تو پھر ایک بار اُسے چارے کے طور پر استعمال کیا جانے والا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سارہ رحمان فریدی کی موجودگی میں قتل ہوئی تھی۔ مجرموں کو علم تھا کہ وہ فریدی سے ملتا چاہتی ہے تو پھر کیا مجرموں کو فریدی یا اُس سے متعلق لوگوں کی تلاش نہ ہوگی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود فریدی اتنی احتیاط سے کیوں کام لیتا۔

سارہ رحمان..... حمید نے طویل سانس لی۔ سارہ رحمان مرجانے کے بعد اور زیادہ حیرت انگیز ثابت ہوئی تھی۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ اس کا پرس بہر حال الجھن کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن آخر فریدی نے قاتل اور اس کے دستاویز کے تذکرے کے بعد خاموشی کیوں اختیار کر لی تھی۔ مونا سے پھر مزید پوچھ گچھ کیوں نہیں کی تھی۔ خود حمید کے ذہن میں تو اس وقت کئی نئے سوالوں نے سر ابھارا تھا۔

فریدی نے مونا سے کہا تھا کہ اب اسے آرام کرنا چاہئے لیکن وہ مصر تھی کہ اُسے واپس بھجوادیا جائے۔

بمشکل تمام حمید نے اُسے کم از کم دو دن کیلئے پروفیسر سے الگ رہنے پر آمادہ کیا تھا۔ کار تیزی سے راستہ طے کرتی رہی۔ یہ وہی کار تھی جس سے حمید نے صبح سفر کیا تھا۔ فریدی نے اُس کی مختلف کنجیوں کے بارے میں اُسے بتاتے ہوئے کہا تھا ”تم اس میں ضرورت کی ساری چیزیں پاؤ گے۔ بس اسے ذہن نشین کر لو کہ کوئی کنجی کہاں لگے گی۔“ اس کے بعد حمید کافی دیر تک کنجیوں سے متعلق مشق کرتا رہا تھا۔

اُسے اُن کھپاؤں کا خیال آیا جن میں ان دنوں فریدی کا قیام تھا۔ اسی جگہ وہ تعداد میں آٹھ تھیں۔ دو گھپاؤں میں قیدی تھے جن کی تعداد ڈیڑھ درجن کے قریب تھی۔ ان میں سے حمید صرف انہیں لوگوں کو پہچان سکا جنہیں پہلے دیکھ چکا تھا۔ بقیہ اسکے لئے اجنبی تھے۔ فریدی نے اُسے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

واپسی پر اسے سڑک پر صرف اپنی ٹوسیٹر کھڑی دکھائی دی تھی۔ دوسری گاڑیاں وہاں نہیں تھیں۔ پھر اُس نے ان کے متعلق فریدی سے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ پوچھ کر کرتا بھی کیا۔ فریدی سے تعلق رکھنے والی ہر بات حیرت انگیز تھی۔

حیرت ظاہر کرنے کے بعد اگر کسی سوال کا جواب نہ ملے تو ذہنی تھکن کچھ اور بڑھی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

اور پھر ذہنی تھکن کا خیال آتے ہی کچ مج اُسے اپنے ذہن پر ایک بوجھ محسوس ہونے لگا۔ سیٹی میں کوئی دھن نکالنے کے لئے ہونٹ سکڑے لیکن سمت مخالف کی تیز ہوائ نے آواز نہ نکلنے دی۔

تب وہ اپنے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ کر خوب صورت لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ مایا بیز جی کی چال بڑی دلکش ہے لیکن جب تیزی سے چلتی ہے تو کسی قدر بھدی لگتی ہے۔

تہمینہ سر کو پیچھے جھٹک کر مسکراتی ہے تو..... کوئی تعظیمہ سوچہ نہ سکی اور وہ براہ راست یاسمین قزلباش کی طرف آ گیا۔ پھر رضیہ یاد آئی۔ وہ اسے پسند تھی۔ نفسیات کے سلسلے میں اس کی چھیڑ چھاڑ وقتی طور پر گراں گذرتی تھی لیکن پھر وہ اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔

یاسمین قزلباش..... اس نے طویل سانس لی۔ اگر وہ رضیہ ہی ہے تو اداکاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ بات اس نے پہلے بھی کئی بار سوچی تھی۔ اُسے خوشی تھی کہ اب وہ اپنے پچھلے میک اپ میں واپس نہیں جا رہا..... ورنہ بڑی دشواری پیش آتی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بھڑک اٹھتی۔

فزارو پہنچ کر وہ اپنی گاڑی پارکنگ شید کی طرف لیتا چلا گیا اور اسی وقت اس کی نظر پولیس کی لاری پر پڑی۔ دو تین مسلح کانسٹیبل لان پر بھی نظر آئے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ حمید نے بڑبڑاتے ہوئے انجن بند کیا۔

گاڑی سے اتر کر سیدھا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

کاؤنٹر پر دو سب انسپکٹر دکھائی دیے، جو شاید کاؤنٹر کلرک سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

کلرک ان سے معذرت طلب کر کے حمید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ قیام کے

لئے کمرہ مل سکے گا۔

”گاڑی سے میرا سامان منگوا لیجئے۔“ حمید نے کہا اور اسے اپنی گاڑی کے نمبر بتائے۔ رجسٹر میں اپنا نام عبدالرشید اور پیشہ کمیشن ایجنسی درج کرایا۔

ہر چند کہ وہ نام اُسے پسند نہیں تھا لیکن زبان سے یہی نکلا تھا۔ اس لئے اب وہ خود کو عبدالرشید ہی محسوس کر رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد وہاں پولیس کی موجودگی کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔

یہ ہنگامہ یاسمین قزلباش نے برپا کرایا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ لہذا وہ لوگ میجر سعید کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

پھر ایک پارٹی یاسمین قزلباش کے ساتھ غالباً اسی جگہ کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی جہاں وہ واقعہ پیش آیا تھا۔

اس نے پولیس کو مونا کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

حمید کو اس کے برابر ہی کمرہ ملا تھا جس میں وہ میجر سعید کی حیثیت سے مقیم رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیچے ڈائننگ ہال میں واپس آیا۔ شام ہوگئی تھی اور اب دھند لکا پھیلنے لگا تھا۔

حمید نے سوچا کہ مزید معلومات کیلئے کاؤنٹر کلرک ہی سے رابطہ و ضبط بڑھانا بہتر ہوگا۔

اس وقت کاؤنٹر کلرک کے پاس غالباً اس کا کوئی دوست بیٹھا قوسے کے متعلق گفتگو کر رہا

تھا۔ حمید کاؤنٹر سے ٹک کر پائپ سلگانے لگا۔ اس کی نظریں سامنے پڑے ہوئے لائف میگزین

کے سرورق پر تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پر چھپی ہوئی تصویر میں بہت زیادہ دلچسپی

لے رہا ہو۔

کاؤنٹر کلرک اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ نیجر صاحب کا ہارٹ فیل اسی رات کو ہوا تھا

جب بوڑھا پروفیسر خراب و خستہ حالت میں واپس آیا تھا۔ پتہ نہیں کیا چکر تھا۔ وہ پروفیسر سے

بیزار بھی تھے اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔ جب وہ بیہوش پڑا تھا تو ان کی کوشش یہی تھی کہ اُسے

میڈیکل ایڈنٹل سکے۔ تب میجر سعید اور مسٹر ساجد پرویز ایک ڈاکٹر کو بلا لائے۔ میرا خیال ہے

کہ اس سلسلے میں میجر صاحب سے ان کی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے جیسے ہی یہ اطلاع دی کہ پروفیسر کی حالت غیر یقینی ہے ان کے قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ اب تم اس سے جو نتیجہ چاہو اخذ کرو۔“

اس نے خاموش ہو کر حمید پر نظر ڈالی اور پھر مخاطب کو جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ دوسرے آدمی نے کہا۔ ”اور یہ میجر سعید اور پروفیسر کی لڑکی والا معاملہ۔“

”کوئی بہت بڑا چکر ہے۔ پروفیسر کو ہوش ہی نہیں آچکتا۔ اس وقت اس کے بستر کے قریب چار مسلح پولیس آفیسر موجود ہیں۔ مونا اور میجر سعید کی تلاش جاری ہے جنہیں کچھ بد معاش پکڑ لے گئے ہیں۔“

کچھ دیر کے لئے وہ پھر خاموش ہو گئے اور حمید لائف میگزین کے ورق التار ہا۔

”آخروہ ایرانی عورت وہاں کیسے جا پہنچی تھی۔“ دوسرے آدمی نے پوچھا۔

”تفریح کے لئے نکلی تھی۔ آگے وہ لوگ اپنے گاڑی میں مونا کو لئے جا رہے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے اپنی گاڑی اسی طرح روکی کہ مس یاسمین کو بھی گاڑی روک دینی پڑی چونکہ مس یاسمین یہیں مقیم ہیں اس لئے انہیں تعاقب کا شبہ ہوا اور انہوں نے انہیں بھی پکڑ لیا۔ مونا سمیت ایک غار میں پہنچے۔ مس یاسمین کا بیان ہے کہ وہ مونا سے میجر سعید کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مونا نے میجر سعید سے کس قسم کی باتیں کی ہیں اور اسے اپنے بارے میں کیا بتایا ہے۔ وہ لوگ کبھی اردو میں گفتگو کرنے لگتے تھے اور کبھی انگریزی میں۔ ورنہ وہ بے چاری تو کچھ بھی نہ سمجھ سکتیں۔ انہیں اردو آتی ہی نہیں۔ بہر حال یہ پوچھ گچھ جاری ہی تھی کہ میجر سعید حیرت انگیز طور پر وہاں پہنچ گیا اور اس نے مونا پر ریوالور سے فائر کئے پھر ایک اور آدمی آیا جس کے ہاتھ میں ٹائی گن تھی۔ اس کے حکم پر ان لوگوں نے میجر سعید کو باندھ لیا اور مونا سمیت اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ مس یاسمین پر اتنی مہربانی کی کہ ان کے کاغذات دیکھ لینے کے بعد انہیں جانے دیا۔ لیکن دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے پولیس کو کچھ بتایا تو ان کی خیر نہیں۔ یار بڑے جگرے کی عورت ہے۔ اب تو اسے ضد ہو گئی ہے۔ سب کچھ پولیس کو بتا دیا ہے اور اب

پولیس والوں کے ساتھ ان لوگوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔“
 ”کیا خیال ہے تمہارا.....!“ دوسرے آدمی نے پوچھا۔ ”کیا یہ میجر سعید بھی کوئی بد معاش آدمی ہے۔“

”میں کیا بتاؤں۔“ کاؤنٹر کلرک طویل سانس لے کر بولا۔ ”میرے ساتھ تو بڑی شرافت سے پیش آیا تھا۔ پرنس ہنری کے تمباکو کی وافر مقدار مجھے دی تھی۔ تم نے کبھی ٹرائی کیا ہے۔ پرنس ہنری۔ میری دانست میں تو اس سے اچھا کوئی اور تمباکو ہے ہی نہیں۔“
 ”کیپٹن کیا برا ہے؟“

”بکو اس ہے..... میں تو اپنے ایک جہازی دوست سے خط و کتابت کر رہا ہوں کہ جب بھی آئے میرے لئے دو درجن ڈبے لیتا آئے۔“
 ”کیپٹن کے مقابلے کا نہیں۔ مانو میری بات۔“
 ”خواہ مخواہ بحث نہ کرو۔“

”لارڈ بوگر ڈوگر بھی کیپٹن ہی کا تمباکو استعمال کرتے ہیں۔“
 اس پر کاؤنٹر کلرک صاحب نے لارڈ بوگر ڈوگر کی والدہ کی شان میں بہت بڑی گستاخی فرمائی اور مخاطب کے چہرے پر بھی کسی قدر برا فروختگی کے آثار نظر آئے۔ لیکن وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے دوسری طرف دیکھتا رہا۔

کاؤنٹر کلرک برا سامنے بنا کر رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر شاید دوسرے آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے لہجے میں دوستانہ نرمی پیدا کر کے پوچھا۔
 ”پھر میجر سعید کا کیا ہوا.....؟“

”میجر سعید کی.....!“
 لیکن قبل اس کے کہ وہ میجر سعید کی والدہ کو بھی نواز بیٹھتا حمید جلدی سے بولا پڑا۔ ”یہاں کون کون سے اخبار آتے ہیں۔“

”اخبار.....!“ کاؤنٹر کلرک جھلا کر مڑا۔ لیکن پھر شاید یاد آنے پر کہ اب وہ ایک گاہک

سے مخاطب ہے سنبھل کر بولا۔ ”کئی اخبار آتے ہیں جناب، سب آپ کو ریڈنگ روم میں مل جائیں گے۔ مجھے چونکہ اخبارات سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے ان کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔“

”خیر..... خیر..... ابھی ابھی آپ نے پرنس ہنری کے تمباکو کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی میں اس سے متفق ہوں۔“

”ہے نا.....!“ وہ جھک کر بولا۔ پھر دوسرے آدمی سے بولا۔ ”دیکھو..... جسے ذرا بھی تمیز ہے مختلف تمباکوؤں میں..... وہ یہی کہے گا۔“

”میاں پیچھا چھوڑ دو میرا۔“ دوسرا آدمی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”جہنم میں جائے پرنس ہنری۔“

”ہٹ دھری سلامت رہے۔“ کاؤنٹر کلرک نے برا سامنہ بنایا اور پھر رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگا۔

”اگر آپ پینا چاہیں تو میں آپ کو پرنس ہنری کا ڈبہ دے سکتا ہوں۔“ حمید بولا۔

”ایک ڈبہ۔“ کاؤنٹر کلرک نے حیرت سے کہا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

”لیکن وہ بہت مہنگا ہوگا۔“

”میں تحفہً پیش کروں گا۔“

”ارے نہیں..... آپ کو کمی پڑے گی۔“

”قطعاً نہیں۔ میرے بڑے بھائی ایک بار بردار جہاز پر چیف انجینئر ہیں۔ ہر ماہ میرا کوئٹہ

بھجوا دیتے ہیں اس میں سے بھی کئی ڈبے بچ رہتے ہیں لہذا احباب کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔“

”تب تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ایک ڈبہ مجھے بھی عنایت فرمائیے اور پھر

ان حضرات کو بھی دکھائی جائے یہ بھی کیا یاد کریں گے۔“

”جی نہیں شکریہ۔“ دوسرا آدمی ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”مجھے اپنا ہی برا بھلا لگتا ہے۔“

اس طرح حمید نے کاؤنٹر کلرک سے دوبارہ اچھی خاصی جان پہچان پیدا کر لی۔ اب وہ

یاسمین کے بارے میں بہت زیادہ تشویش میں پڑ گیا تھا۔ اگر اس کا تعلق مجرموں ہی سے ہوتا تو

وہ پولیس کو ہرگز بیان نہ دیتی۔

لیکن اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا تھا۔ وہ فریدی ہی کے کام کرنے والی کوئی لڑکی بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے امکانات پر بھی حمید نے بار بار غور کیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر اس نظر سے گزر کر دیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو خود اس سے راز داری برتنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ دونوں مل کر کیوں نہ کام کرتے۔ اگر یہ یاسمین درحقیقت رضیہ ہی تھی تو درزی خانے میں وہ ایک دوسرے کے لئے کیوں اجنبی بنے رہتے۔ کیا مصلحت تھی اس میں۔ لیکن آخر وہ کم بخت درزی خانہ ہی کس مرض کی دوا تھا۔ کیا مقصد تھا اس کے قیام کا اور پھر وہ اس طرح بند کیوں کر دیا گیا۔ حمید پائپ میں تمباکو بھر کر اُسے دیا سلائی دکھانے ہی والا تھا کہ یاسمین قزلباش ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوئی۔ حمید نے اُسے دیکھ کر اتنی گہری سانس لی تھی کہ کاؤنٹر کلرک کو بھی اس کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا تھا۔

”آخر کس جنگل کا جانور ہے؟“ حمید نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ ”خدا و خال مشرقی ہی لگتے ہیں لیکن لباس ٹھیک مغربی ہے۔“

”ایرانی ہیں جناب۔ یہی تو ہیں مس قزلباش جن کو یہ واقعہ پیش آیا تھا.....؟“

”اوہو..... اچھا..... اچھا..... ایرانی ہیں۔ خوب۔ ایرانی لڑکیاں میری کمزوری ہیں۔“

کاؤنٹر کلرک نے دانت نکال دیئے۔

یاسمین کی نظر حمید پر پڑی اور حمید نے محسوس کیا جیسے وہ ایک پل کے لئے ٹھکلی ہو۔ پھر آگے بڑھتی چلی گئی۔

”حق..... حق..... قیامت ہے۔“ حمید مضحکہ انداز میں ہک لایا۔

”بے حد بخیدہ عورت ہے۔ میں نے ابھی اُسے مسکراتے نہیں دیکھا۔“ کاؤنٹر کلرک بولا۔

”میں تمہیں اس کے لئے پاگل ہو کر دکھا دوں گا۔“ حمید نے کہا۔

”آپ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جناب.....!“ دوسرے آدمی نے طنزیہ لہجہ میں کہا تھا۔

حمید نے مسکرا کر اُسے آنکھ ماری اور کسی گھٹیا قسم کے عیاش آدمی کی طرح اپنی جیب پر

ہاتھ پھیرنے لگا۔

”نہ بزورِ دہ بزاری نہ بزرمی آئید.....!“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”مجھے فارسی نہیں آتی۔ مطلب بھی سمجھاؤ۔“ حمید غصیلے لہجے میں بولا۔

”یہ بڑی بدتمیزی کی بات ہے کہ بغیر تعارف کسی سے بے تکلف ہوا جائے۔“ کاؤنٹر کلرک نے دوسرے آدمی سے کہا اور پھر معذرت طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”ہم تو یاروں کے یار ہیں۔“

”یہ بات ہے تو لاؤ ادھر ہاتھ۔“ دوسرا آدمی اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ حمید نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس اسی طرح ہنس بول کر دن گزارتے ہیں۔“

دوسرا آدمی تحسین آمیز نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک حمید ہی کے ہاتھ میں تھا۔

”اچھی بات ہے دوست۔“ اس نے بالا خر کہا ”ہمارا وقت اچھا ہی گزر جائے گا۔“

”یہ مسٹر شفقت ہیں.....!“ کاؤنٹر کلرک نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”رام گڈھ کے مشہور گلوکار..... اپنا ثانی نہیں رکھتے۔“

”بڑی خوشی ہوئی۔“ حمید ایک بار پھر گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتا ہوا بولا۔ ”مجھے رشید

کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں وائیلن بہت اچھا بجاتا ہوں۔“

”ضرور..... ضرور..... انگلیاں یہی کہہ رہی ہیں۔“

اتنے میں یاسمین پھر دکھائی دی۔ کاؤنٹر ہی کی طرف آتی معلوم ہوتی تھی۔

حمید کا اندازہ درست ہی نکلا۔ اس نے قریب آ کر کاؤنٹر کلرک سے وقت پوچھا تھا اور

اپنی گھڑی ملائی تھی۔

”کہتے..... کچھ سراغ ملا۔“ کاؤنٹر کلرک نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”نہیں! ہم ان غاروں میں بھی دیکھ آئے اور پل تک بھی گئے۔ ان کا کہیں سراغ نہیں

۔ بے چاری لڑکی۔ پتہ نہیں وہ درندے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے شاید آپ اب واپس چلی جائیں۔“

”ناممکن..... مجھے یہ ایک دلچسپ لیکن ڈراؤنا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ اب تو میں تفصیل معلوم کرنے کے لئے بہر حال ٹھہروں گی۔“

”جی ہاں..... جی ہاں!“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”آپ کو پلاٹ مل جائے گا۔ اچھا۔ آپ کہانیاں ہی تو لکھتی ہیں۔“

”میں رات کا کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں گی۔“ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔

”ناک پر کبھی ہی نہیں بیٹھنے دیتی سالی۔“ کاؤنٹر کلرک بڑبڑایا۔
 زینوں کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار پھر مڑی تھی۔ حمید نے محسوس کیا جیسے اس بار مرکز نگاہ صرف وہی رہا ہو۔

اُن دونوں نے بھی شاید اُسے محسوس کر لیا تھا اور پر معنی انداز میں مسکرا رہے تھے۔
 ”واقعی آپ بلا کے بجلیے ہیں جناب۔“ کاؤنٹر کلرک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
 ”کیوں.....؟ کیوں بھی۔“

”شاید ہی کسی کو اس نے نظر بھر کر دیکھا ہو..... کمال ہو گیا۔“
 ”کیا کمال ہو گیا۔“ حمید نے انجان بن کر پوچھا۔
 ”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ مڑ کر آپ کو دیکھتی رہی تھی۔“
 ”وہم ہوگا.....!“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور پھر چونک کر بولا۔
 ”اوہ..... میں آپ کے لئے تمباکو تو لیتا آؤں۔“

پھر ان کی کوئی بات سننے بغیر وہ بھی زینوں کی طرف بڑھ گیا۔
 تیزی سے زینے طے کئے اور اپنے کمرے والی راہداری میں مڑ ہی رہا تھا کہ آواز آئی
 ”ٹھہریے۔“

حمید چونک کر مڑا۔ یاسمین قزلباش دوسری راہداری کے سرے پر کھڑی تھی۔
 حمید کے مڑنے پر اس نے کہا۔ ”میں بس ایسی معمولی ہی سی اردو جانتی ہوں۔“

”بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اردو جانتی ہیں۔“ حمید نے اردو ہی میں کہا۔

”وہ میرا کمرہ ہے۔“ یاسمین نے ایک جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”چلے۔“ حمید دوسری راہداری میں مڑ گیا۔

یاسمین اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ لیکن کمرے میں داخل ہونے میں اس نے پہل کی۔

”وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ آپ بہت مغرور ہیں۔“ حمید نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

”میں خود کو لئے دیئے رہنے کی عادی ہوں۔“

”انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ایران سے تعلق رکھتی ہیں۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”کیا میں اس ملاقات کو تقریب کا رنگ دے سکتا ہوں۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اب وہ انگریزی ہی میں گفتگو کر رہا تھا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کیا اسکیم میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔“ اس بار یاسمین قزلباش

نے خالص اردو میں پوچھا۔

”کچھ دیر مجھے اور ٹھہرنے دیجئے یہاں۔ آپ تو لاٹینی بھی بولنے لگیں گی۔“

”میں پوچھتی ہوں آپ میک اپ کے بغیر کیوں نظر آ رہے ہیں۔“

”کوسمیٹکس کی گرانی..... میکس فیکٹر کی لپ اینک کا عادی تھا۔ دوسرے برائے قطعی پسند

نہیں ہیں۔“

”سنجیدگی سے گفتگو کیجئے۔“

”کیا ایرانی مرد.....!“

”پلیز کیپٹن حمید۔“

”عبدالرشید نام ہے خاکسار کا۔“

”مجھے کرنل صاحب سے آپ کی شکایت کرنی پڑے گی۔“ اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا

”محترمہ رضیہ..... آپ خود کو کیا سمجھتی ہیں۔“

”میرا نام رضیہ بھی نہیں ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
 ”محترمہ..... لفاتن..... ہیں.....!“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے حمید کو گھورتی رہی پھر بولی۔ ”اسی خدشے کے تحت کرنل نے آپ پر میری اصلیت نہیں واضح کی تھی کہ پھر کام نہیں ہو سکے گا۔“
 ”اب تو کام تمام ہو گیا نا۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔
 ”اچھی بات ہے..... آپ جاسکتے ہیں۔“
 ”نفیات پر کچھ نہیں ہوئی۔ بہت دنوں سے کان پیاسے ہیں۔“
 وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ”آپ کی ڈاڑھی اکثر یاد آتی تھی اور وہ پہاڑ خانم۔“
 ”قاسم.....!“

”جواب نہیں ہے اس کا بھی۔“ اس نے کہا اور پھر چونک کر بولی۔ ”الجھالیا آپ نے..... میں پوچھ رہی تھی کہ آپ میک اپ کے بغیر کیوں نظر آ رہے تھے۔“
 ”پہلے تم مجھے اپنا جغرافیہ سمجھانے کی کوشش کرو۔“
 ”میرا تعلق نصیر آباد آفس سے ہے۔ میں نے ایک معاملے میں کرنل سے مدد طلب کی تھی۔“
 ”نصیر آباد آفس.....!“ حمید نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم لیڈی انسپکٹر زبیا تو نہیں ہو۔“

”ہاں یہی ہے میرا نام.....!“
 ”تذکرہ سنا تھا۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اور کوشش بھی کی تھی کہ کچھ دنوں کے لئے آن ڈیپوٹیشن نصیر آباد چلا جاؤں۔“

حمید نے سوچا درزی خانے والا چکر بھی لگے ہاتھوں سمجھ لینا چاہئے۔ لیکن پھر خاموشی رہا۔ کیا وقعت رہ جاتی اس کی نظروں میں۔ کرنل فریدی اپنے ماتحتوں پر اعتماد نہیں کرتا۔ انہیں حالات سے بے خبر رکھتا ہے۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ زبیا نے کہا۔

”جو حکم ملا۔ اس پر عمل کر ڈالا گیا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ وقت اتنا کم تھا کہ اس کی وجہ بھی نہ معلوم کی جاسکی۔ ورنہ صبح تک تو میک اپ ہی میں تھا۔“

”کہاں تھے؟“

”کچھ وقت تو تمہارے ساتھ بھی گزرا تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اسی غار میں محترمہ زیبا جس کی زیارت کرانے لے گئی تھیں۔ آپ یہاں کے ٹھکوں کو۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“

”میجر سعید محترمہ۔“

”وہ..... وہ..... آپ تھے؟“ زیبا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”جناب.....!“

”لل..... لیکن..... پھر آپ کیسے رہا ہوئے..... اس مردود نے تو پانسہ ہی پلٹ دیا تھا آکر.....؟“

”جی..... یہ آپ نے کس مردود کا تذکرہ کیا ہے۔“

”وہی..... جو آپ کو بندھوا لے گیا تھا۔“

حمید نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ ”اگر اس بیچارے کو علم ہو جائے کہ آپ نے اُسے کن الفاظ میں یاد فرمایا تھا تو شاید وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کی راہ لے۔“

”پلیز کیپٹن..... مجھے الجھن میں نہ ڈالئے۔“

تب حمید نے اُسے پوری داستان سنائی اور وہ بڑی دیر تک متحیرانہ انداز میں حمید کی طرف دیکھتی رہی۔

پھر بولی۔ ”خدا کی قسم! میرے تو ہاتھ پیر پھول جاتے کہ آدمیوں کو کیسے باندھ لے جاؤں؟ اُن کے ذہن کو کون پاسکتا ہے۔“

”مجھے اس پر حیرت ہے کہ انہوں نے تم کو رخصت کرتے وقت کوئی ہدایت کیوں نہیں

دی اور تم نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کیسے کر ڈالا۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ بھی چاہتے تھے جو کچھ میں نے کیا ہے۔“

”کیوں؟ کس بناء پر.....؟“

”میرا دل مطمئن ہے؟ کیا آپ ٹیلی پیٹھی میں یقین نہیں رکھتے۔“

”صرف اسی حد تک کہ وہ دو دلوں کا معاملہ ہو۔“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی ہے۔

دفعتاً راہداری سے کچھ عجیب قسم کے شور کی آواز آئی وہ چونک پڑے۔ شاید کوئی وزنی چیز گھسیٹی جا رہی تھی۔

ساتھ ہی کوئی کہتا جا رہا تھا۔ ”ابے خانا نہیں خاتے قیام لوغ..... جراسا ہولڈال نہیں اٹھا سکتے..... قیوں.....؟“

”صاحب آپ خواہ مخواہ لائے ہولڈال..... یہاں بستر وغیرہ سب ملتا ہے۔“ کسی نے جواب میں کہا تھا۔

”تمہارے بستر کا قیام کھانا..... کل کوئی بھنگی ونگی لیٹا ہوا اس پر تو.....!“

”ارے یہ ماں کیسے۔“ حمید نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”پہاڑ خانم ہی ہے نا..... آواز ویسی ہی ہے۔“

”بالکل وہی مردود ہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا..... وہ مجھے پہچان لے گا۔“

”لیکن اُسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟“ حمید نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ وہ آپ ہی کے لئے آیا ہو۔“

”ہاں..... دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ کسی نگری سی عورت کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا

ہے یا پھر یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اس کو..... خیر میں دیکھتا ہوں۔ جب تک واپس نہ

آؤں کرے سے باہر نہ نکلتا۔“

حمید نے دروازے کی طرف مڑتے وقت ریڈی میڈ میک اپ کا سامان جیب سے نکال

لیا تھا۔

وہ دونوں

دو پورٹر ایک بہت بڑے اور وزنی ہولڈال کو گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے سے گزرنے کی کوشش کر رہے تھے اور قاسم قریب ہی کھڑا انہیں غیرت دلا رہا تھا۔

”اور..... زور لگا کے..... ہاں..... یا علی..... اور جور سے..... ہمت تیری تی..... اچھا ہو..... بس دغ لیا..... میرے طرح بھینس کا دودھ پیا کرو.....!“

دونوں پورٹر الگ ہٹ گئے اور قاسم نے جھک کر اس ہولڈال کو اس طرح اٹھالیا جیسے بچے گیند اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس سمیت وہ دروازے سے تو نہیں گزر سکتا۔

”اب دیکھو حرامی پن.....!“ وہ جھلا کر بولا۔ ”سالوں نے یہ جرا جرا سے دروازے بنائے ہیں۔ قیسے گھسوں اور قیسے گھسیڑوں۔“

پورٹروں نے منہ دبا کر ہنسنا شروع کر دیا۔

”اے ہنستے ہو بے شرمو۔“ قاسم نے اس وزنی ہولڈال کو اسی طرح اٹھائے ہوئے کہا۔ ”دنیا اتنی ترقی کر رہی ہے اور یہ لوغ ٹھیک سے دروازے بھی نہیں بنا سکتے۔“

”صاحب..... پہلے ہولڈال کو اندر پھینک دیجئے۔“

”اور پھر خود گھس جاؤں قیوں.....؟“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”اور کیا حضور عالی.....؟“

”اے ہاں ٹھیک تو ہے؟“ قاسم آہستہ سے بڑبڑایا اور ہولڈال کو اٹھا کر اندر پھینک دیا۔

”اور اب آپ.....!“

”اے ہاں گھس رہا ہوں۔“ قاسم پھر جھلا کر بولا۔ ”جلدی قیا ہے؟“

”کچھ نہیں صاحب..... کچھ نہیں..... اچھا اب اجازت دیجئے۔“

”خانے میں قیا ملے گا.....!“

”صاحب یہ تو بابو صاحب ہی بتا سکیں گے۔“

پورٹروں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ چاپ زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ حمید بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ زینے ملے کرتے وقت اس نے ناک کے نتھنوں سے اسپرنگ نکال لئے۔ پھر اُسے تمباکو کا ڈبہ یاد آ گیا اور اُسے اُنکے پاؤں واپس ہونا پڑا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر کاؤ پر دکھائی دیا۔ کاؤنٹر کلرک اب تنہا ہی تھا۔ تمباکو کا ڈبہ سنبھالتے ہوئے اس نے بڑی لجاجت سے حمید کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”ابھی مجھے زینوں کے قریب ہی ایک دیوڑا نظر آیا تھا..... یہ کون ہے۔“

”ارے صاحب حد ہوگئی۔“ وہ راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہاں

کیسے حیرت انگیز واقعات پیش آرہے ہیں۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا۔ حد ہوگئی۔“

”کیوں کیا ہوا.....؟“

”وہ صاحب ضروری کاررائیوں کے بعد اوپر گئے ہی تھے کہ ایک محترمہ تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ انہیں ان صاحب کے برابر والا کمرہ دیا جائے۔ یہ بے حد ضروری ہے اور وہ اس کے لئے مجھے کوئی معقول رقم بطور انعام بھی دے سکیں گی۔ حالانکہ ایک کمرہ اس کے برابر ہی خالی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”دے دو نا..... مفت کے پیسے ہاتھ آئیں گے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”نہیں صاحب.....! وہ اس کی بیوی ہوگی چھپ کر اس کی مصروفیات کا جائزہ لینا چاہتی

ہوگی۔“

”ہاں معلوم تو بیوی ہی ہوتی ہیں۔ کچھ ہی کم ہوں گی ان صاحب سے۔ لیکن ہیں

جوان۔ چہرے مہرے کی بھی اچھی ہیں۔ اپنا نام ثریا لکھا گئی ہیں۔“
 ”یعنی تمہارا خیال ہے کہ قد و قامت میں کچھ ہی کم ہوگی۔“

”جی ہاں.....!“

حمید نے پر تشویش انداز میں سر کو جنبش دی۔

”اب بتائیے کیا خیال ہے۔“

”میری دانست میں تو تمہارا کوئی نقصان نہیں اس میں اگر برابر والا کمرہ خالی ہے۔“

”خالی ہے جناب۔“

”دے دو.....!“

کلرک طویل سانس لے کر بولا۔ ”اچھی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو دے دوں گا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں ان پر نظر رکھوں گا۔ کوئی گڑبڑ دیکھی تو تمہیں آگاہ بھی کر دوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“ وہ کھیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”لیکن جناب کسی سے

کہئے گا نہیں کہ مجھے اس کے لئے پیسے ملتے ہیں۔ آپ کو اپنا سمجھ کر بتا دیا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“

واپسی پر حمید نے دونوں اسپرنگ پھرنتوں میں فٹ کر لئے۔ ناک کی نوک اوپر اٹھ گئی

اور اسی کیساتھ اوپری ہونٹ بھی اس طرح اوپر اٹھتا چلا گیا کہ سامنے کے دانت دکھائی دینے لگے۔

زیبا کے کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہینڈل

گھما کر دروازے کو دھکا دیا۔ وہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔ اس لئے اُسے بے تحاشہ کمرے میں

داخل ہو جانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

زیبا نے اُسے دیکھا اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔

”یہ کیا بیہودگی ہے۔ کون ہو تم..... اس طرح بغیر اجازت.....!“

حمید کچھ نہ بولا۔ خاموش کھڑا اُسے گھورتا رہا۔

”فتحاً زیبا نے اپنے بلاؤز کے گریبان سے اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا۔

”کون ہو تم.....!“ اس بار اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔

”ایں ک اداس اور تنہاں آدیں.....!“ حمید ناک کے بل بولا۔

”نکلو باہر..... نکل جاؤ..... اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ.....!“

حمید نے ہاتھ اٹھائے تو لیکن وہ صرف چہرے تک آ کر رہ گئے۔ اس نے اپنا منہ چھپا لیا

تھا اور پھر جب ہاتھ چہرے سے ہٹے تو دونوں اسپرنگ نتھنوں سے نکل کر مٹھی میں آ چکے تھے۔

”ارے.....!“ زیبا لڑکھڑاتی ہوئی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

حمید بڑی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”کمال ہے۔“ زیبا انک انک کر بولی۔ ”کیا یہ جادو تھا۔“

”نہیں..... ہماری روحانی قوت کا کرشمہ۔ بولو کیا چاہتی ہو۔“

”نہیں بتائیے۔ میں نے ایسی حیرت انگیز تبدیلی آج تک نہیں دیکھی۔“

”کیا آپ اپنی ناک کی نوک اس طرح اٹھا سکتی ہیں۔“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن..... نتھنے پھلائے جاسکتے ہیں..... لیکن ناک اس

طرح اوپر نہیں اٹھائی جاسکتی۔“

”اوچی ناک والے ہیں۔“

”خدا کی قسم دو گھنٹے متواتر دیکھتے رہنے کے بعد بھی نہ پہچان سکتی۔“

”اب اس قصے کو ختم کرو۔ میں سنجیدگی سے کچھ دیر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”سنجیدگی سے۔“ زیبا نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔ ”آپ اور سنجیدگی۔“ یہ بھی آپ ہی

جائیں۔ میں کیا بتا سکوں گی۔“

”دوسرا چکر اور بھی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی عورت کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا ہے لیکن معاملہ برعکس ہے۔“

”یعنی.....!“

”کوئی عورت اس کا تعاقب کرتی ہوئی یہاں آئی ہے۔“

”میں پھر نہیں سمجھی۔“

حمید اُسے اپنی اور کاؤنٹر کلرک کی گفتگو کا حاصل بتاتا ہوا بولا۔ ”اب دیکھنا ہے کہ وہ

عورت کون ہے۔“

”عورتیں ہی آتی ہیں آپ کے حصے میں۔“ زیبا اٹھلائی۔

”نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“

”اوہ..... تو اب آپ کو بھی دلچسپی ہو گئی ہے نفسیات سے۔“

”یہ بھی ایک نفسیاتی نکتہ ہے..... جب کوئی پوسٹ گریجویٹ درزن دل کے چاک رفو

کرتی ہے تو اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔“

”کیا اب ہم رومانی قسم کی گفتگو کریں گے۔“ زیبا نے حیرت سے کہا۔

”ڈیپارٹمنٹ کے رولز اینڈ ریگولیشن میں کہیں اس کا تذکرہ موجود نہیں کہ ڈیپارٹمنٹ کی

خواتین سے رومانی گفتگو نہ کی جائے۔“

”اوہ..... ہاں..... تو آپ کیا کہہ رہے تھے اس عورت کے متعلق۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ حمید نے پر تھکر لہجے میں کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”کیا تم

پروفیسر اور اس کی لڑکی کی نگرانی کرتی رہی تھیں۔“

”ہاں..... میں نصیر آبادی سے ان کا تعاقب کرتی ہوئی آئی تھی اور کرئل صاحب کو اس

کی اطلاع دی تھی۔“

”آخر پروفیسر اور اس کی لڑکی پر تمہیں کس بات کا شبہ تھا۔“

”گولڈن ایرو سے متعلق ہونے کا۔“

”کس بناء پر۔“

”سارہ رحمان پروفیسر ہی کی پروردہ تھی اور میں نے کچھ مشتبہ آدمیوں کو پروفیسر سے ملتے

بھی دیکھا تھا اور یہ بھی محسوس کیا تھا کہ پروفیسر اُن سے ملنے کے بعد بہت زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہاں آ کر ایک دن پروفیسر اچانک غائب ہو گیا۔ لڑکی تنہا رہ گئی۔ لیکن وہ مطمئن نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھنا تھا کہ پروفیسر کہاں غائب ہو گیا۔ ہو سکتا تھا کہ لڑکی اس سے باخبر ہوتی۔ لہذا وہ جب بھی باہر جاتی تھی میں اس کی نگرانی کرتی رہتی تھی۔“

”پھر تم نے کیا دیکھا.....!“

”کچھ بھی نہیں..... وہ ہر شام باہر ٹہلنے جاتی تھی اور ساجد بھی اُس کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ وہ بھی نصیر آباد ہی کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے ایک بار آپ کے ساتھ بھی دیکھا تھا۔ اگر آپ واقعی میجر سعید کے میک اپ میں تھے۔“

”اس آدمی کے بارے میں تم کیا جانتی ہو۔“

”ساجد نام ہے..... نصیر آباد کا ایک معمول آدمی ہے۔ لیکن نیک نام نہیں۔“

”کیا خیال ہے؟ وہ بھی گولڈن ایرو سے تعلق رکھتا ہوگا۔“

”یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی۔“

”اس کا کوئی بھائی واجد نامی بھی تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”یقیناً تھا اور بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔“

”پھر قاتل کا کیا بنا۔“

”ابھی تک تو نصیر آباد کی پولیس اس کیس کو حل نہیں کر سکی۔“

پھر وہ سارہ رحمان کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ دفعتاً فریدی کا خیال آ گیا۔ پتہ نہیں وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر زیب نے پوچھا۔ ”آپ نے واجد کے بارے میں کیوں پوچھا تھا۔“

”کہیں نام سنا تھا۔“

”کہاں سنا تھا.....؟“

”کیوں.....؟“ حمید نے اُسے گھور کر دیکھا۔

”بس یونہی..... میرا خیال ہے کہ آپ نے اسکا نام سارہ رحمان کے سلسلے میں سنا ہوگا۔“

”شاید.....؟ پھر!۔“

”دونوں گہرے دوست تھے؟“

”پھر تو پولیس نے اُسے گھیرا ہوگا؟“

”صرف سوالات کئے تھے۔ میرے محکمے نے انہیں ہدایت دی تھی کہ اُسے زیادہ پریشان

نہ کیا جائے۔ دراصل وہ ہم لوگوں کی نگرانی میں تھی۔“

”اُس کے باوجود بھی نکل بھاگی نصیر آباد سے.....؟“

”میری عدم موجودگی میں ماتحوں نے میری ہدایات پر عمل نہیں کیا ورنہ وہ ایک پل کے

لئے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکتی۔“

”لیکن تمہیں درزن بننے کے شوق نے گھیرا تھا۔“

”ہمیں ایک تجربہ کرنا تھا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ بات نازک مرحلے پر آ پہنچی تھی۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اُسے اس

تجربے کے بارے میں علم نہیں تھا۔

کمرے کی فضا پر پھر خاموشی چھا گئی۔ حمید جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرنے لگا۔

”اب اس کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا۔“ زیبا کچھ دیر بعد بولی۔

”کس کا.....!“

”اسی مولے کا..... غائب قسم کا ذہن رکھتا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی رضیہ کا نعرہ لگا بیٹھے گا۔ یہ

سوچے بغیر کہ وہ خود میرے سامنے ہمیشہ ایک عورت کے میک اپ میں آتا رہا ہے۔“

”یہ بات تو ہے؟“ حمید کا لہجہ پر تشویش تھا۔ ”تم آخر میک اپ میں کیوں نہیں رہتیں۔“

”اس کا سلیقہ ہی نہیں ہے؟ ویسے بھی میں صرف اپنا ذہن استعمال کرنے کی قائل ہوں۔“

”چوٹ کر رہی ہو ہم پر..... کیوں؟“

”نہیں..... اپنی ایک کمزوری کا اظہار کر رہی ہوں۔“

”حالات جب ایسے ہوں تو سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔“ حمید نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”آپ تو بُرا مان گئے۔ میں نے یونہی کہہ دی تھی یہ بات۔“

”تم سے زبردست حماقت سرزد ہوئی۔ تمہیں اس واقعہ کی پیلٹی نہ کرنی چاہئے تھی۔ بس

چپ چاپ ہوٹل تبدیل کر دیتیں۔ پروفیسر اور اس کی نگرانی کا معاملہ تو کھٹائی میں پڑ ہی گیا تھا۔

یہ لوگ زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تو تمہیں جانتا ہی ہوگا۔“

”انہیں شہجے میں ڈالنے ہی کے لئے تو یہ ایرانی بہروپ ہے۔“

”لیکن مجھے یقین تھا کہ تم رضیہ ہی ہو۔“

”اس خیال کی تصدیق کے لئے کبھی مجھے مخاطب کرنے کی ہمت تو نہیں پڑی تھی۔“

”میجر سعید کے میک اپ میں یہ ایک احمقانہ حرکت ہوتی۔ کیا تم مجھے بھی قاسم سمجھتی ہو۔“

”ارے جائیے۔“

”خیر چھوڑو..... ہٹاؤ..... یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیسا لگا۔“

”بے حد بور.....!“ وہ ہنس پڑی۔

”زندگی تلخ کر دوں گا۔“

”ارے حمید صاحب۔“ زیبا نے مضحکہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔

”اچھی بات ہے۔ دیکھ لیتا۔“

”بہت دیکھے ہیں حمید صاحب۔“

”نفسیاتی نکتہ نظر سے نہ دیکھے ہوں گے۔ اچھی بات ہے۔ اب میں جا کر اس کی خبر

لوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے کمرے ہی تک محدود رہو۔“

”بہت بہتر حمید صاحب۔“

حمید اس کے طنزیہ لہجے پر بھٹا گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر

اسپرنگ پھرتھنوں میں فٹ کر لئے۔

راہداری سنان پڑی تھی۔ قاسم والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ نکلا چلا گیا۔ اپنے

کمرے میں آ کر وہ جیکٹ نکالی جسے الٹ کر بھی پہنا جاسکتا تھا۔ اسٹرکچر اس انداز میں لگایا گیا تھا کہ وہ بھی اپر ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس انتظام کے ساتھ وہ ڈاننگ ہال میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی مقامی گاہک ہو۔ اس کے لئے اُسے عقبی زینے استعمال کرنے پڑے تھے اور صدر دروازے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔

قاسم کو کاؤنٹر کے قریب کھڑے دیکھا۔ وہ بلند آواز میں کلرک سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”اے تم دنبہ مسلم نہیں سمجھتے اور بیٹھے ہو کاؤنٹر پر۔“

”جناب عالی یہ ہمارے مینو میں شامل نہیں ہے۔“

”نہ ہوگا..... اب شامل ہو سکتا ہے۔ ایک دمبہ منگوا لو..... میں خود ذبح کر دوں گا۔ خال

بھی خود ہی اتار دوں گا..... حالانکہ میں اکڑوں نہیں بیٹھ سکتا۔“

”حضور والا..... آپ کیوں خواہ مخواہ یہ ساری تکالیف اٹھائیں۔“

”بھوخوں مریں حضور والا سالے.....!“ قاسم جل کر بولا۔ ”دل کشا والے پچھلے سال

میرے لئے دمہ مسلم تیار کراتے تھے۔“

حمید نے کاؤنٹر کے قریب ہی کی ایک میز منتخب کی۔ ناک میں اسپرنگ موجود تھے اس

لئے وہ بہ آسانی قاسم کے قریب ہی رہ سکتا تھا۔

”کیا مرغ مسلم سے کام نہیں چلے گا۔“ کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔

قاسم کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا..... ”کھیر چلو یہی سہی..... مالوم کراؤ کتنے تیار ہیں۔“

”آخر آپ کو کتنے درکار ہوں گے۔“

”بیس..... اور کچھ اسٹیک و سٹیک کھا کر کام چلا لوں گا۔“

کاؤنٹر کلرک دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”قیاسوچ رہے ہو۔“

”جناب عالی..... بارہ روپے کا ایک بیٹھتا ہے۔“

”اے ہاں اتنی ارجمینک مجھے بھی آتی ہے۔ دوسو چالیس روپے ہوئے بیس کے۔“

”اور آپ دو سو چالیس روپے ایک وقت میں.....!“

”روپے نہیں چباؤں گا..... مرغ کھاؤں گا..... جالدى..... کارو.....!“

”بب بہت بہتر جناب۔“ کاؤنٹر کلرک نے سہے لہجے میں کہا۔

اتنے میں حمید نے دیکھا کہ ایک قد آور اور تندرست عورت کاؤنٹر کے قریب آکھڑی ہوگئی ہے۔ چہرے مہرے کی اچھی تھی۔ رنگت سرخ و سفید آنکھیں خاصی دل کش تھیں۔

ساتھ ہی حمید نے یہ بھی محسوس کیا کہ قاسم صاحب اس کے قرب کی بناء پر شدید ترین بوکھاہٹ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

”یہاں کروں کی سروس کا انتظام کیا ہے۔“ عورت نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔

”مناسب ہی ہے محترمہ..... آپ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ کریں گی۔“

”پتہ نہیں میرے پڑوسی کیسے ہوں۔“ عورت نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”روم نمبر گیارہ ہے آپ کا شاید.....!“

”جی ہاں۔“

”ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔“ کاؤنٹر کلرک نے کہا اور رجسٹر کے ورق اٹھنے لگا پھر بولا۔

”وہ ایک تو آپ ہی ہیں۔“ اس نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اوہ..... اچھا.....!“ عورت نے اس طرح کہا جیسے پہلی بار قاسم پر نظر پڑی ہو۔ پھر وہ

مسکرائی اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”مجھے ثریا کہتے ہیں۔

یہاں کے مناظر پیٹ کرتی ہوں۔“

قاسم اضطراری طور پر اس سے مصافحہ کرتا ہوا ہکھلایا۔ ”تق..... تق..... قاسم.....!“

”یعنی قاسم صاحب۔“

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ قاسم کے دانت ”نقل“ پڑے۔

”آپ کا کیا مشغلہ ہے۔“ عورت نے پوچھا۔

”میں بھی..... پپ..... پیٹ کرتا ہوں۔“

”خاص موضوع کیا ہے۔“

”بب..... بالکل ہی کھاس موجد ہے۔“

”وضاحت بھی تو کیجئے؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”وضاحت..... وضاحت..... جی..... دراصل مجھے بھون لگی ہے..... کھانا کھا کر.....

کردوں گا۔“

”یعنی بھوک کی حالت میں آپ گفتگو نہیں کر سکتے۔“

قاسم نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

اس پر پتہ نہیں کتنے قہقہہ حمید کے پیٹ میں گھٹ کر رہ گئے۔

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے.....!“ عورت بولی۔

”بب..... برا نہ مانئے گا۔“ قاسم لجاجت سے بولا۔ ”بھوکا ہوتا ہوں تو بے وقوفی کی

باتیں کرنے لگتا ہوں۔“

”بہت دلچسپ ہیں آپ.....!“ عورت منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی اور قاسم بھی جھینپے ہوئے

انداز میں ”ہی ہی ہی“ کرنے لگا۔

اتنے میں ایک ویٹر نے آہستہ سے کاؤنٹر کلرک سے کچھ کہا اور اس کے چہرے پر تشویش

کے آثار پائے جانے لگے۔

پھر وہ قاسم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا تو چاہتا ہو

لیکن کسی خدشے کے تحت کہہ نہ سکتا ہو۔

قاسم نے بھی اُسے محسوس کر لیا تھا شاید۔ لہذا بھاڑ سامنے پھیلا کر بولا۔

”قیابات ہے؟“

”جج..... جناب عالی..... صرف بارہ عدد تیار ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتا..... سمجھے..... بیس عدد..... قیا سمجھے؟“

”حضور والا..... کل صبح نو بجے سے پہلے مزید مرغوں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔“

”ہائیں تو کیا میں کل صبح نو بجے تک بھو خا بیٹھا رہوں گا.....!“

”میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب۔“

”میں اس ہوٹل کو نیلام قرار دوں گا..... سمجھے..... قیا سمجھتے ہو۔“

”میں بھی اس کے ساتھ ہی نیلام ہونے کو تیار ہوں۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں

کر سکتا۔“ کلرک نے بھی کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

قاسم کو بہت زور سے غصہ آ گیا تھا۔ لیکن عورت جلدی سے بول پڑی۔

”کیا قصہ ہے..... آپ کیوں خفا ہو رہے ہیں۔“

”میں مرغوں سے کم میں میرا قیام نہیں چلے گا.....!“

”پالیں گے؟“

”ہی ہی ہی ہی..... آپ تو مزاح کرتی ہیں۔“

”پھر.....؟“

”ارے خاؤں گا..... میں نے تو دہمہ مسلم مانگا تھا..... مگر یہ مرغ دیتے ہیں۔ پھر پورے

میں بھی نہیں۔ بارہ عدد..... رات بھر بھوخ کے مارے نیند نہیں آئے گی۔“

”میں مرغ کھائیں گے آپ.....!“ عورت نے حیرت سے کہا۔

”اور کچھ اسٹیک وغیرہ بھی کھا کر کام چلا لیتا۔“

”میں مرغ اور کچھ اسٹیک وغیرہ۔“

”مجبوری ہے..... ورنہ ایک دہمے سے کام چل سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے پیٹ

تو بھر جاتا ہے مگر جی نہیں بھرتا..... ایک ایک مرغ اٹھا کر کھا رہے ہو..... کچھ پتہ ہی نہیں چلتا

کدھر گئے۔“

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“

”جی ہاں.....!“

”تب تو آپ کے کھانے کا منظر دلچسپ ہوتا ہوگا۔“

”اجی میں کیا..... ہی ہی ہی۔“ قاسم خاکسارانہ انداز میں ہنسا۔

”تو ایسا کیجئے..... بارہ مرغ..... کچھ اسٹیک..... اور بقیہ سلائیز وغیرہ سے کام چلائیے۔“

”نہیں چلے غا.....!“ قاسم کا لہجہ بے حد مغموم تھا۔

”بتائیے..... میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔“ عورت یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔

”مم..... میرے لئے۔ یعنی کہ آپ ہی ہی ہی۔“ قاسم نے دانتوں میں انگلی دبائی

اور پلکیں جھپکائیں۔

حمید کا جی چاہا کہ اٹھ کر کم از کم پچاس جوتے رسید کرے۔

”یہاں میری ایک عزیزہ کے پاس گیارہ درجن بطخیں ہیں جب تک آپ بارہ مرغ ختم

کریں گے میں آٹھ بطخیں منگوا لوں گی۔“

”بطخ بھی لذت بخشتی ہے۔“ قاسم نے کہا اور اس طرح منہ چلانے لگا جیسے بطخ کے گوشت

کی بوٹی دانتوں کے درمیان ہو۔

”آپ کہاں تکلیف کریں گی محترمہ۔“ کاؤنٹر کلرک جلدی سے بول پڑا۔

”ہمارے پاس گوشت سے تیار کی جانے والی اور بھی بہت سی اشیاء مل سکیں گی۔ صاحب

ان میں سے کچھ منتخب کر لیں گے۔“

”اے تو تمہارا دم کیوں نکل رہا ہے۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”حضور عالی..... ہوٹل کے کچھ قوانین بھی ہیں۔“

”پہلے ہم ہیں..... پھر کوائن اور کوائن ہیں۔“ قاسم سینے پر ہاتھ مار کر دہاڑا اور کاؤنٹر

کلرک کی گھٹھی بندھ گئی۔

”جانے دیجئے..... جانے دیجئے۔“ عورت آہستہ سے بولی اور قاسم یکلخت نرم پڑ گیا۔

عورت نے پھر کہا۔ ”ممکن ہے یہاں گاہکوں کی لائی ہوئی چیزیں نہ پکائی جاتی ہوں۔“

”یہی بات ہے محترمہ۔“ کلرک نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”چلئے..... آج اس طرح گزارا کر لیجئے۔ کچھ کولڈ بریف وغیرہ لے لیجئے گا۔“

”اللہ مالک ہے۔“ قاسم نے ٹھنڈی سانس لی پھر جھلا کر بولا۔ ”تو وہ بارہ مرتبے ہی منگوا دو نا..... بھونخ کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔“

”یہیں یا اپنے کمرے میں کھانا پسند کریں گے۔“

”چلئے..... وہیں اوپر چلیں۔“ عورت نے کہا۔ پھر کاؤنٹر کلرک سے بولی۔ ”میرا کھانا بھی اوپر ہی بھجوائیے۔“

”بہت بہتر محترمہ۔“

پھر حمید نے دیکھا کہ قاسم لڑکھڑاتا ہوا اس عورت کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ اس دوران میں حمید نے کافی منگوائی تھی اور اب ٹھنڈی کافی کی چسکیاں اُسے گراں گزرنے لگی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عورت قاسم کے لئے بالکل ہی اجنبی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اُسے اپنے قریب دیکھ کر بُری طرح گڑبڑا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا اس نے پہلے بھی کہیں اسے دیکھا تھا۔ اوہ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود قاسم ہی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہو اور اس تعاقب کی ترغیب خود عورت ہی کی طرف سے ہوئی ہو جسے قاسم جیسا کوڑھ مغز ترغیب کی حیثیت سے نہ سمجھ سکا ہو۔

عورت اس معاملے میں فطری طور پر تربیت یافتہ ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض مادہ جانوروں کے جسم کی بومیلوں دور تنہا بھٹکنے والے ز جانوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ بالکل یہی ہوا ہے۔ وہ خود ہی اُسے اپنے پیچھے لگالائی۔

حمید مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فائر

کافی ختم کر کے حمید پھر اٹھا..... کاؤنٹر پر جا کر کافی کی قیمت ادا کی اور باہر نکل آیا۔ اب

وہ اپنی شکل میں دوبارہ ڈانگنگ ہال میں واپس جانا چاہتا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ جیکٹ کو الٹ لیا جائے۔ لہذا وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں چل پڑا جہاں کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

تھوڑے ہی فاصلہ سے ڈھلان شروع ہو گئی تھی جس کے سرے پر چیرے کے درختوں کی قطار نصف دائرے کی شکل میں دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ اس نے سوچا ادھر ہی سہی۔ دیکھنے والے سمجھیں گے رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی ہو رہی ہے۔ لہذا وہ ٹہکتا ہوا اسی طرف چل پڑا۔

آسمان میں بادل نہیں تھے اس لئے اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ دفعتاً حمید نے محسوس کیا جیسے چیزوں کے درختوں کے درمیان کوئی ڈھلان میں اتر رہا ہو۔

تھا وہ دھندلا سا ہیولی ہی لیکن انداز ایسا تھا جیسے اُسے بھی دیکھ لئے جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ حمید ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جو فرار کی روشنیوں کی زد سے دور تھی۔ لہذا وہ بڑی پھرتی سے سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا۔

پھر سینے کے بل زمین سے لگ کر آگے گھسنے کی رفتار خاصی تیز تھی۔

ہر چند کہ وہ سایہ اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن حمید کو اندازہ تھا کہ وہ ڈھلان کے سرے پر کسی جگہ غائب ہوا ہے۔ وہ ریٹکتا ہوا ٹھیک اسی جگہ جا پہنچا۔ نیچے تک ڈھلان صاف نظر آرہی تھی جیسے ہی اُس نے سر کو اٹھا کر دور تک دیکھنے کی کوشش کی نیچے سے آواز آئی! ”چلے آؤ فرزندہ۔“

”لا حول ولا قوۃ.....!“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ یہ بھی وہ حضرت نکلے..... کہیں بھی دھول دھپے کا موقع میسر نہیں آتا..... آخر ہاتھ پیر میں جان کیسے آئے گی۔“ وہ تیزی سے آواز کی جانب ڈھلان میں اترتا چلا گیا۔

دوسرا سایہ گھٹنوں کے بل بیٹھا نظر آیا..... حمید نے اس کے قریب ہی پہنچ کر دم لیا۔ ”سخت قسم کی نالائقیاں سرزد ہو رہی ہیں تم سے۔“ سائے یا فریدی نے کہا۔ ”یہی اطلاع دینے کے لئے اس وقت میں نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔“

”میرا قصور.....!“ حمید کے لہجے میں زہریلا پن تھا۔

”تم اس کے کمرے میں کیوں گئے تھے؟“

”اس نے مجھے اشارہ کیا تھا۔ اُسے تشویش تھی کہ آپ کی کسی اسکیم کے برخلاف میں

یہاں میک اپ کے بغیر کیوں پایا جاتا ہوں۔“

”اور پھر اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“

”جناب! صرف زبیا ہی نہیں بلکہ ایک عدو ثریا کا سہرا بھی میرے ہی سر ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”قاسم کو دیکھا آپ نے.....؟“

”ہاں..... مجھے حیرت ہے۔“

”اوہ..... گرائڈیل عورت بھی نظر سے گزری یا نہیں۔“

”ہاں..... آں..... اُسے بھی دیکھا تھا۔“

”اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام ثریا درج کرایا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ وہ قاسم کو

اپنے ساتھ لائی ہے۔“

پھر حمید نے ان دونوں کے بارے میں جو کچھ سنا اور دیکھا تھا دہراتے ہوئے کہا۔ ”میرا

تو یہی خیال ہے کہ عورت کی ترغیب خفی ہی اُسے یہاں تک لائی ہے اور وہ احمق یہی سمجھ رہا ہوگا

کہ وہ اس کے علم میں آئے بغیر اُس کا تعاقب کرتا رہا ہے۔“

”ہوسکتا ہے“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”لیکن ایسے حالات میں یہ محض اتفاق تو نہیں ہوسکتا۔“

”کیسے حالات میں۔“

”میں کیا بتاؤں کہ زبیا سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ درزی خانہ ختم ہونے کے بعد

اُسے ایسی مہمات میں میک اپ کا سہارا ضرور لینا چاہئے تھا۔“

”درزی خانہ.....!“ حمید نے طویل سانس لی۔

”اُس کے متعلق بھی تمہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہوگا۔“

”اُسے کیا بڑی تھی کہ خود ہی بتاتی..... اور میں اس شرمندگی کی وجہ سے پوچھ نہیں سکا کہ وہ کیا خیال کرتی..... یہی ناکہ کرئل فریدی کو اپنے نائب پر اعتماد نہیں۔“

”خاصے عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔ حالانکہ میں نے تمہیں محض اس بناء پر نہیں بتایا تھا کہ کہیں تم آزادانہ طور پر اپنی عقل نہ استعمال کر بیٹھو اور کھیل بگڑ جائے۔ اچھی بات ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ اب تمہیں بھی بتا ہی دوں۔“

پھر وہ دونوں ڈھلان پر اترتے چلے گئے۔ حمید پیچھے تھا اور فریدی اندھیرے میں بھی ایسی ہی آسانی سے راستہ ملے کر رہا تھا جیسے بارہا دیکھا بھالا راستہ ہو۔
حمید خاموشی سے اُس کی تھلید کرتا رہا۔ کئی بار گرتے گرتے بچا تھا۔ آخر جھنجھلا کر بولا۔
”کہاں جاتا ہے۔ کب تک چلنا پڑے گا۔“

”بس زیادہ دور نہیں۔“ فریدی نے جواب دیا۔ آواز میں تھکن کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔

پھر جلد ہی حمید کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ یاد یوں آیا کہ اب وہ گھنٹوں اور ہتھیلیوں کے بل ایک غار کے چھوٹے سے دہانے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس سے قبل فریدی سے بھی یہی حرکت سرزد ہوئی تھی۔ وہ آگے تھا اور نارچ کی روشنی میں حمید کو راستہ دکھاتا جا رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد ایسی کشادہ جگہ پہنچ گئے جہاں حمید اطمینان کی سانس لے سکتا تھا۔
”یہاں اطمینان سے گفتگو کر سکیں گے۔“ فریدی نے کہا اور نارچ بچھا دی۔
”اندھیرے ہی میں۔“

”کیا اندھیرا تمہاری شجاعت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔“

”آپ کی صورت دیکھے بغیر باتوں میں مزا نہیں آتا۔ ہاں، جب پھول کی پنکھڑیوں کے سے ہونٹ جنبش کرتے ہیں اور کسی بات پر زور دیتے وقت اداہلی ہونٹ نیم دائرے کی شکل اختیار کرتا ہے تو کچھ نہ پوچھئے کہ دل پر کیا گزرتی ہے۔“

”ٹٹ اپ..... وقت کم ہے میں تمہیں کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ غور سے سنو۔ اب

زیبا سے دور ہی رہنا۔ تمہارے لئے میک اپ میں ہونا چنداں ضروری نہیں ہے۔ البتہ اسپرنگ والے میک اپ کو جب چاہو بروئے کار لا سکتے ہو۔ قاسم سے دور ہی رہنے کی کوشش کرنا۔ اسپرنگ والے میک اپ کو تم اس سے بچے رہنے کے لئے استعمال کر سکتے ہو۔ پھر تمہیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ عورت اُسے یہاں کیوں لائی ہے۔“

”میں درزی خانے کے بارے میں کچھ سننے کا منتظر ہوں۔“

”ہوں..... اوں..... بتاؤں گا۔“ فریدی نے کہا اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”میں بہت دیر سے گولڈن ایرو کی فکر میں تھا اور گولڈن ایرو والے بھی میری فکر میں تھے۔ انہیں دو آدمیوں کو اپنی راہ سے ہٹانا تھا اور اتفاق سے وہ دوسرا آدمی بھی میں ہی ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”انہیں فریدی کی فکر بھی ہے اور اُس دوسرے آدمی کی زندگی کے بھی خواہاں ہیں جس نے اُن کے مقابلے میں گولڈن ایرو ہی کے نام سے اپنا کاروبار بھی چلا رکھا ہے۔“

”میرے خدا..... تو اب آپ جس فروشی پر اتر آئے ہیں۔“

”سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال میں عرصہ سے اُن کی فکر میں تھا۔ اسی دوران میں زیبا نے مجھ سے مدد طلب کی۔ اُس کا خیال ہے کہ گولڈن ایرو کا ہیڈ کوارٹر نصیر آباد ہی میں ہے۔ اُس نے اُن کی تجارت کا ایک طریقہ کار دریافت کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ طریق کار پہلے ہی سے میرے علم میں تھا۔ بہر حال اُس کے ایک نئے نظریے کی تصدیق کرنے کے لئے مجھے درزی خانہ قائم کرنا پڑا تھا۔“ فریدی خاموش ہو گیا۔

”میں جاگ رہا ہوں۔“ حمید بولا۔

”وہ درزی خانوں کے ذریعے بھی کاروبار کرتے ہیں۔ یہ میں پہلے سے جانتا تھا۔ زیبا اس پر مصرتھی کہ جب بھی کہیں کوئی نیا درزی خانہ قائم ہوتا ہے گروہ کا کوئی فرد اس میں ضرور جگہ بنالیتا ہے۔ اس طرح کہ درزی خانے کے مالک یا دوسرے ملازموں کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔“

”اوہو..... تو کیا ہمارے یہاں بھی ایسا کوئی آدمی تھا۔“

”بالکل تھا..... تھا نہیں بلکہ تھی۔“

”کون.....!“

”سب سے زیادہ متین اور سنجیدہ لڑکی فرزانہ۔“

”اوہو..... یہ کیسے ممکن ہے۔ مطلب یہ کہ کیا ہمارے درزی خانے کے ذریعے بھی یہ کام

ہو چکا ہے۔“

”قطعاً ہو چکا ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ حمید مضطربانہ بڑبڑایا۔

”وہ دن یاد کرو جب ایک گاہک عورت نے شلوار کی موریوں کے بارے میں شور مچایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ موریوں میں بکرم نہیں رکھا۔ موریاں زیبائی بناتی تھی۔ دونوں میں جھڑپ ہوئی تھی۔ تم زیبا پر بگڑے تھے اور فرزانہ نے یہ کہہ کر بات ختم کرادی تھی کہ اب موریاں وہی بنایا کرے گی اور وہ اس کی ایکسپرت ہے۔ پھر اُس کے بعد ہی سے وہ کاروبار شروع ہو گیا تھا۔ حمید صاحب بکرم کی تہہ میں کوکین رکھی جاتی تھی۔“

”سر پیٹ لینے کو جی چاہ رہا ہے اس وقت۔“ حمید نے کھسیانے انداز میں کہا۔

فریدی کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اُس نے کہا۔

”اس تجربے کے بعد درزی خانہ ختم کر دیا گیا اور فرزانہ محکمے کی حوالات کے سپرد کردی گئی۔“

”تو کیا عورتوں میں کوکین بہت زیادہ رواج پا رہی ہے۔“

”کپڑے سلوانے والیاں براہ راست گاہک نہیں ہوتیں بلکہ وہ بھی گروہ ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ گولڈن آئرو کی منشیات دراصل کئی ہاتھوں سے گزر کر گاہکوں تک پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تک سرگروہ پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔“

”تو یہ کھڑاگ اسی لئے پھیلایا ہے آپ نے کہ سرگروہ پر ہاتھ ڈال سکیں۔“

”یقیناً..... اس کے بغیر گروہ نہیں ٹوٹ سکتا۔“

فریدی شاید کچھ سوچنے لگا تھا۔ حمید بھی کچھ نہ بولا۔ اب اس کا ذہن سارہ رحمان کی

طرف منتقل ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو گولڈن ایرو ہی کا شکار ہوئی تھی۔ اُس کا کیا قصہ تھا..... اور پھر یہ پروفیسر.....!

”اب تم سارہ رحمان کے متعلق سوچ رہے ہو گے۔“ دفعتاً فریدی بولا۔

”خدا کی پناہ..... اندھیرے میں آپ کو اس قدر بھائی دیتا ہے؟“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”اُس کے بارے میں پھر بتاؤں گا۔ وقت کم ہے۔ اب آؤ قاسم کی طرف۔ میرا خیال

ہے کہ وہ یاسمین قزلباش کی شناخت کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”تم بھی شے میں مبتلا رہ چکے ہو کہ وہ رضیہ ہی ہو سکتی ہے۔“

”یقیناً.....!“

”تو پھر کیا وہ بھی اس فکر میں نہ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ فرزانہ کی گرفتاری ان سے پوشیدہ

نہ ہوگی۔“

”پوشیدہ تو صرف مجھ سے رہی ہے۔“ حمید جل کر بولا

”سچ پوچھو تو مجھے اسکے بعد بے کبھی اتنی فرصت ہی نصیب نہیں ہوئی کہ تمہیں کچھ بتا سکتا۔“

”اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

”زیبا کو نزارو سے ہٹا دو..... اگر وہ اُسے اغواء کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو شاید وہ زندہ

ہی نہ چھوڑیں۔“

”ہٹا کر کہاں لے جاؤں؟“

”تم خود اُسے دلکشا تک پہنچاؤ..... پھر وہاں سے کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ تم یہ کام

اسپرنگ والے میک اپ میں رہ کر انجام دے سکتے ہو۔ اس کا خیال رہے کہ اُسے دلکشا تک

لے جاتے وقت کوئی تمہارا تعاقب نہ کر سکے۔“

”تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ بھی میک اپ میں ہو۔“

”جو مناسب سمجھو کرو.....!“

”اُسے میک اپ کرنا نہیں آتا اور..... اور میں کسی نامحرم عورت کے گال کیسے چھوسکوں گا۔ معاذ اللہ.....!“

”اٹھو اور باہر نکلو.....!“ فریدی نارج روشن کرتا ہوا بولا۔ ”تم فرار دہی میں مقیم رہو گے۔ بغیر میک اپ.....!“

”قاسم..... میری جان کو آجائے گا۔“

”پڑواہ مت کرو..... تمہیں اُس سے یہ بھی تو معلوم کرنا ہے کہ وہ یہاں پہنچا کس طرح۔ دوسری بات۔ کل یہاں کی پولیس مونٹا چنگیزی کو تلاش کرے گی اور پولیس ہیڈ آفس میں کیپٹن حمید کا انتظار کیا جائے گا۔ کیپٹن حمید کے علاوہ اور کوئی اس کا بیان نہیں لے سکے گا۔“

”واقعی..... یہ دوسری ہوئی۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میرا سارا دھیان تو زیبا کی طرف ہو گا۔ مونٹا میں کیسے دلچسپی لے سکوں گا۔“

”بکومت..... وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تمہیں محتاط رہنا پڑے گا۔ بیان من وعن لکھنا..... جرح مت کرنا۔“

”ظاہر ہے آپ کے بیان پر جرح کی ہمت کسے ہو سکے گی۔“

”چلو.....!“ فریدی نے اُسے غار کے دہانے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

غار کے دہانے پر پہنچ کر فریدی نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر حمید نے وہیں اپنی جیکٹ الٹی تھی اور فرزانہ کی طرف چل پڑا تھا۔

ڈائینگ ہال خاصہ آباد تھا۔ حمید کاؤنٹر کی طرف توجہ دیئے بغیر زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پھر اچھی طرح یقین ہو جانے کے بعد کہ اُس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا اُس نے زیبا کے دروازے پر دستک دی تھی۔

زیبا نے اُس وقت تک دروازہ نہیں کھولا تھا جب تک اُس کی آواز نہیں سن لی۔

حمید نے اُسے فریدی کی ہدایات کے متعلق بتاتے ہوئے کہا ”میک اپ کا معمولی سا سامان میرے پاس موجود ہے۔ اگر کہو تو.....؟“

”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھے اس کا سلیقہ نہیں۔“

”تو پھر میں کیسے کر سکوں گا۔“

”کیوں... آپ کیوں نہ کر سکیں گے۔“

”ارے بھئی..... یہ گال وال سب چھوٹے پڑیں گے؟“

”تو کیا ہوا.....؟“

”اگر کچھ نہیں ہوا..... تو..... تو..... تو.....!“

”حمید صاحب ہم دونوں کا عہدہ ایک ہی ہے۔“

”لیکن ایسے حالات میں میرے لئے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگا۔“

”الفاظ سے نہ کھیلئے..... کام کیجئے۔“

”گف..... کام..... اچھی بات ہے۔ میں ابھی آیا۔“ اس نے کہا اور وہاں سے نکل کر

اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پھر ایک گھنٹہ بعد وہ اس کے ساتھ فزارو سے اس طرح باہر نکل رہا تھا جیسے وہ دونوں ہی ریکریشن ہال میں بیٹھ کر بہت زیادہ پی گئے ہوں۔ حمید کی ناک کے نتھنوں میں اسپرنگ موجود تھے اور زبیا کی شکل بدلی ہوئی تھی۔

وہ اپنا سارا سامان اُسی کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ دلکشا سے فون پر فزارو کے کاؤنٹر کلرک کو آگاہ کیا کہ وہ رات باہر ہی گزارے گی۔

دلکشا کے ڈائننگ ہال میں بھی کھنی آبادی نظر آئی تھی۔ شاید ایک بھی میز خالی نہ رہی ہوگی۔ اس لئے انہیں ریکریشن ہال کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں ٹویمٹ ہو رہا تھا۔

”ناچوگی.....!“ حمید نے پوچھا۔

”ایسی احمقانہ حرکتوں سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔“

”لیکن نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“

”سب کو اس ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ سامان کے بغیر کمرہ حاصل

کرنا دوسروں کو شبہات ہی میں مبتلا کرنا ہوگا۔“

”اور اگر شبہات کو یقین میں بدلنا ہو تو پھر ہمیں کمرہ لے ہی لینا چاہئے۔“

”کیپٹن..... پلیز سٹاپ..... میں الجھن میں ہوں۔ مجھے کیا سوچھی تھی کہ آپ کو خواہ

مخواہ اشارہ کیا تھا۔“

”کمرہ حاصل کرنے کے لئے۔“

”خدا کی قسم ہاتھ چھوڑ دوں گی۔ انپکٹر ریکھنا نہ سمجھنا۔“

”اچھا تو اب میں چلا.....!“

”ہرگز نہیں.....!“

”ارے..... تو پھر کیا کروں۔“

”چلو ٹویسٹ کریں گے۔“

”میری شکل دیکھ رہی ہو.....!“

”جج..... بڑی کربہہ شکل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ ناک کی نوک کیسے اٹھ

جاتی ہے اوپر.....!“

”محترمہ..... پہلی ملاقات میں سب کچھ نہیں معلوم ہو جایا کرتا۔“

پھر انہیں جج جج تھوڑی دیر تک تو ٹویسٹ کرنا پڑا تھا اور جب راؤ غر ختم ہو جانے کے بعد وہ

خالی میزوں کی جانب بڑھ رہے تھے ایک آدمی نے حمید سے ٹکرا کر آہستہ سے کہا تھا۔ ”باہر آؤ۔“

آواز فریدی کی تھی۔ لیکن حمید اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ کیونکہ وہ تیزی سے دوسری

طرف مڑ کر بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔

حمید زبیا کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

”کیا بات ہے..... کہاں.....؟“

”بس چلی آؤ..... زحمت سے بچ گئیں.....!“ حمید نے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”بس چلی آؤ..... کان نہ کھاؤ۔“

وہ باہر آئے۔ سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی گاڑی کے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے انہیں اشارہ کیا۔ حمید پھر شے میں پڑ گیا کہ وہ فریدی ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ یہ بچہ چلی دو ملاقاتوں والا چہرہ نہیں تھا اور ڈھلان پر اندھیرے میں صحیح طور پر اُس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا۔ نارچ کی روشنی میں بھی اس کی پوزیشن کچھ ایسی ہی رہی تھی کہ صورت نہیں دکھائی دی تھی۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر حمید بولا۔ ”پہلے کچھ گنگنا کر سنائیے..... پھر یقین کر لوں گا۔“
 ”زیبا گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“ اُس نے حمید کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا اور حمید کو یقین آ گیا وہ فریدی ہی ہے۔

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر زیبا کو مخاطب کیا۔
 ”قسمت میں ہے تو پھر ملیں گے۔“

گاڑی چلی گئی۔ حمید کھڑا حسرت بھری نظروں سے اندھیرے میں گھورتا رہا۔ زیبا اُسے پسند تھی۔ اس نے سوچا تھا تنہائی کا احساس کچھ دنوں کے لئے رفع ہو جائے گا۔ لیکن قاسم کی آمد نے کھیل بگاڑ دیا۔

”اچھی بات ہے۔“ وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑایا۔ ”اب اس بھینسے کو ذبح کرنا ہی پڑے گا۔“
 اُسے یقین تھا کہ اس وقت قاسم فرازو کے ریکرییشن ہال میں رجگا منار ہا ہوگا۔
 فرازو پہنچ کر اس کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ قاسم اور ثریا ریکرییشن ہال ہی میں موجود تھے اور یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہی تھا کہ حمید کو ٹھیک اُن کے قریب ایک میز خالی مل گئی۔

اس وقت حمید کے نتھنوں میں اسپرنگ نہیں تھے اور وہ دور سے بھی پہچانا جاسکتا تھا۔ اس میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے حمید اپنے مخصوص اسٹائل میں کھارے۔ قاسم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی روح قبض کر لی گئی ہو۔ ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ حمید نے محسوس کیا کہ اُس کی اس از خود رنگی کی بناء پر ثریا بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ اب وہ کبھی

تو قاسم کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی حمید کی طرف۔

آخر وہ قاسم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“
قاسم چونک کر بڑبڑایا۔ ”کک..... کچھ نہیں۔“

پھر شاید اُس نے آہستہ سے یہی پوچھا تھا کہ وہ کون ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ قاسم کے ہونٹ ملتے حمید ایک بار پھر کھکارا۔ اس بار کھکار نے کا انداز وارننگ کا ساتھ۔

دفعۃً قاسم اُسے گھونسا دکھا کر بولا۔ ”کھکارے جاؤ سالے..... میں بھی دغ لوں گا۔“
”ارے ارے..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ثریا جلدی سے بولی۔

”اگر آپ کی جان پہچان کے ہوں تو انہیں بھی یہیں بلا لیجئے۔“

”ہر گج نہیں۔ اس سالے پر تو میں دس میل سے بھی پیشاب نہیں کروں گا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے محترمہ۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔ ”اُن کی بیوی میری آپا جان ہیں۔“
”اُف.....!“ ثریا گڑبڑا گئی۔ پھر اُس نے قاسم کی طرف دیکھا۔

”جھوٹا ہے سالہ..... وہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور یہ کسی اور کا لڑکا نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں میں تو آسمان سے ٹپکا ہوں۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ پھر ثریا کو مخاطب کر کے کہا۔

”شاید یہ حضرت آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی۔“

”ابے چوپ.....!“

”آپ بھی یہیں آجائیے نا.....!“ ثریا نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

حمید اٹھ کر اُن کی میز کے قریب جا بیٹھا۔ قاسم قہر آلود نظروں سے اُسے گھورے جا رہا تھا اور شاید ثریا کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ لیکن چہرے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ لاوا پھٹ پڑنے کو زور مار رہا ہے۔

بالآخر وہ دانت پیس کر گھونسا دکھاتا ہوا بولا۔ ”تم سالے میری قبر میں بھی گھس آنا.....“

”اچھا۔“

”آپ خاموش بھی رہنے کچھ دیر۔“ ثریا بولی اور قاسم نے کچھ بد بدلتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیرا۔

”شاید آپ ان کے کوئی بے تکلف دوست ہیں۔“ ثریا نے حمید سے کہا۔

”اجی لانت بھیجو ایسی دوستی پر.....!“ قاسم پھر پلٹ پڑا۔

”آپ میری بات نہیں مانیں گے۔“

”مانو غا.....!“ قاسم نے غرا کر پھر منہ پھیر لیا۔

”میں ان کا بے حد بے تکلف دوست ہوں۔ اتنا کہ ان کی بیوی کو بھابھی کی بجائے آپا جان کہتا ہوں۔“

”سچ سچ ان کے سالے ہیں.....؟“

”آپ یقین کر لیں گی اگر اس نے ہاں کہہ دیا۔“ قاسم پھر بول پڑا۔

”یہ یارے بھائی میں خواہ مخواہ ہاں کہنے ہی کیوں لگا۔“ حمید نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

لیکن قاسم پھر انٹھ کر منہ پھیر چکا تھا۔

”آپ لوگ انہیں تنہا کیوں سفر کرنے دیتے ہیں۔“ عورت نے پوچھا۔

”کیوں..... کیا ہوا.....؟“ حمید نے بوکھلاہٹ ظاہر کی۔

”کچھ نہیں..... ویسے اگر میں دخل اندازی نہ کرتی تو انہوں نے فزارو کو الٹ پلٹ کر رکھ

دیا ہوتا۔ میں عدد مرغ طلب کر رہے تھے اور فی الوقت بارہ سے زیادہ دستیاب نہیں تھے۔ پہلے تو

پورا دمبہ مانگا تھا۔“

”اس کے باوجود بھی آدمیوں کو کھانے دوڑتا ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

”بس چلے جاؤ۔“ قاسم مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ”میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔“

”ارے..... ارے..... بیٹھے..... یہ کیا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ ثریا منمنائی۔

دھننا ایک فائر ہوا۔ ہال کے کسی گوشے سے ایک چیخ ابھری اور قاسم ہانپتا ہوا بیٹھ گیا۔

حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔

خون کے دھبے

عجیب افرا تفری کا عالم تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر گر رہے تھے اور میزیں دھڑا دھڑاٹ رہی تھیں۔

”شروع ہو گیا۔“ قاسم حمید کو گھونہ دکھا کر بولا۔ ”ابے منھسو تم لوغ جہاں جاؤ گے۔“
پھر حمید کی گونجدار ”شٹ اپ“ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ ثریا بڑی طرح بدحواس نظر آ رہی تھی۔

”چلو..... نقلو یہاں سے۔“ قاسم اس کا بازو پکڑ کر بولا۔ ”نہیں تو ابھی یہ سالہا یہاں قے سارے دروازے بند کرادے گا۔“

حمید اُن دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دراصل سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر اپنے اختیارات استعمال کرے یا خود بھی تماشائی بنا رہے۔

پتہ نہیں کس نے فائر کیا تھا اور وہ چیخ کس کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہال خالی ہو گیا۔
ہوٹل کے عملے اور حمید کے علاوہ اب وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

ان میں وہ کاؤنٹر کلرک بھی شامل تھا جس سے حمید کی گفتگو ہوتی رہی تھی۔

”کیوں چیخ جناب۔“ وہ حمید کے قریب آ کر ہکلا یا۔ ”کلک کیا ہوا۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا ہوا.....؟“

”آپ نے بھی فائر کی آواز سنی تھی۔“

”بالکل سنی تھی۔“

”اور چیخ بھی۔“

”ہاں ہاں چیخ بھی سنی تھی۔“

”لل..... لیکن..... نہ کوئی لاش نہ کوئی زخمی.....!“

”یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟“ حمید نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کیوں.....؟ کیوں.....؟“

”میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ لڑکیاں جب خوفزدہ ہو کر بھاگتی ہیں تو دیکھنے کی چیز ہوتی ہیں۔“
 کاؤنٹر کلرک نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا پھر زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا ہوا اسٹنٹ
 منیجر کی طرف متوجہ ہو گیا جو اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔
 ”لیس سر.....!“ اب وہ اُس کا بہت احترام کرنے لگا تھا کیونکہ مرحوم منیجر کی جگہ اُسی نے
 سنبھالی تھی۔

”دیکھو..... کوٹا..... کوٹا..... تلاش کرو.....؟“

حمید نے منیجر کی طرف غور سے دیکھا اور یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اُسے کس چیز کی تلاش ہے۔
 ”لاش جناب.....!“
 ”کیا ضروری ہے۔“

”ایسے مقامات پر جب بھی فائر ہوتے ہیں تو مقصد قتل ہی ہوتا ہے۔“ منیجر نے کسی قدر
 ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”اچھی بات ہے تو تلاش کیجئے۔“

”آپ کون ہیں.....؟“

حمید نے اپنا کارڈ جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہاں
 میں عبدالرشید ہوں..... اس کا خیال رہے۔“

منیجر کا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا جس میں کارڈ تھا۔ اُس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”جی بہت اچھا جناب۔“

اور کارڈ حمید کو واپس کر دیا۔ کاؤنٹر کلرک نے منیجر کی بدلتی ہوئی حالتوں سے اندازہ کر لیا
 تھا کوئی خاص بات ہے۔ اس لئے اب حمید کو عجیب نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

”بات یہ ہے جناب عالی۔“ منیجر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ ”شکاریوں سے کچھ
 بعید نہیں ہے۔ پچھلے سال نشاط میں اسی طرح ایک فائر ہوا تھا۔ لیکن اُس وقت کچھ نہیں معلوم ہوا

تھا۔ پھر دوسری صبح بچن میں ایک لاش پائی گئی تھی۔ جس کی کھوپڑی میں سوراخ تھا۔“

”اچھا تو پھر میں بھی اس تلاش میں حصہ لینا پسند کروں گا۔“

وہ آگے بڑھے۔ بعد کارخ ایک کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں۔

حمید کا اندازہ تھا کہ وہ عمارت کے باہر سے زمین کی سطح سے پانچ فٹ کی بلندی پر ضرور ہوگی۔

قریب پہنچنے پر چوکھٹ کے پاس تازہ خون کا دھبہ دکھائی دیا۔

”دیکھئے.....!“ فیجر کا نپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرا خیال غلط تو نہیں تھا۔ لاش یقینی طور

پر دوسری طرف پڑی ملے گی۔“

باہر اندھیرا تھا۔ فیجر کی تجویز تھی کہ انہیں دوسری طرف چل کر دیکھنا چاہئے۔ ریکرییشن

ہال سے بھاگنے والے باہر نہیں گئے تھے اس لئے ڈاننگ ہال میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ انہیں روکے رکھا جائے۔“ حمید نے فیجر سے کہا۔

ویسے یہاں اس وقت بھی دو ڈیوٹی کانسٹیبل موجود تھے۔ میجر سعید اور ساجد پرویز کے

کروں کی نگرانی ان کے ذمے تھے۔ انہوں نے یہاں کی بھگدڑ کے بارے میں قریبی پولیس اسٹیشن کو بذریعہ فون مطلع کر دیا تھا۔

”میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ معلوم ہونا چاہئے۔“ حمید نے فیجر سے کہا۔ ”آپ ان

کانسٹیبلوں سے اپنے طور پر کہہ دیجئے کہ کسی کو باہر نہ جانے دیں۔“

”بہت بہتر جناب۔“

حمید اس وقت خود باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا ہو سکتا ہے خود اُسی کے لئے کسی

قسم کا جال بچھایا گیا ہو۔

اُسے تو اس بھیڑ میں قاسم کی تلاش تھی۔ وہ اُسے ڈانینگ ہال میں ڈھونڈتا پھرا لیکن

کامیابی نہ ہوئی۔ پھر اُس نے سوچا وہ عورت اُسے اوپر لے گئی ہوگی۔

زینے طے کر کے وہ اس راہداری میں پہنچا جس میں قاسم کا کمرہ تھا۔ دروازہ کھلا نظر آیا۔

پردے کے پیچھے روشنی تھی اور قاسم بڑے زور شور کے ساتھ اپنے ”ٹھائیں ٹھوئیں“ کے تجربات بیان کر رہا تھا۔

حمید نے دروازے کے قریب رک کر اونچی آواز میں کہا۔ ”کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“
 اندر خاموشی چھا گئی۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دیا اور کسی نے پردہ ہٹایا۔ یہ ثریا تھی۔
 ”اوہ..... آپ.....!“ وہ چہک کر بولی۔ ”اندر تشریف لائیے..... ہم دونوں آپ ہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں قاسم صاحب آپ کو پسند نہیں کرتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آپ سچ مچ ایسے ہی منحوس ہیں..... جہاں چلے جائیں وہاں لاشوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

”اس کا خیال بالکل درست ہے۔ اُسکے خاندان کے مردے ہماری ہی فرم دفن کرتی ہے۔“
 ”آئیے..... آئیے..... اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“

حمید کمرے میں داخل ہوا۔ قاسم منہ پھلائے اُسے قہر آلود نظروں سے گھورے جارہا تھا۔
 ”تشریف رکھئے۔“ ثریا نے کہا اور حمید قاسم کے موڈ کی پرواہ کئے بغیر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
 کمرے کی فضا پر بوجھل سا سکوت مسلط ہو گیا تھا۔ آخر حمید ہی نے خاموشی توڑی۔
 ”میں مغل تو نہیں ہوا.....؟“

”قطعاً نہیں! ویسے ہم یہ معلوم کرنے کیلئے بے چین ہیں کہ ریکریشن ہال میں کیا ہوا تھا۔“
 ”ایک فائر..... ایک چیخ..... اُس کے بعد ہال خالی ہو گیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ فائر کس نے کیا تھا اور نہ یہی پتہ چلا کی چیخ کس کی تھی۔“
 ”قاتل و مقتول کی تلاش جاری ہے۔“

”تو تم..... کیا یہاں بینگن چھیلنے آئے ہو..... کاتل و مقتول کی تلاش جاری ہے۔“ قاسم منہ ٹیڑھا کر کے جملے کئے لہجے میں بولا۔

”پتہ نہیں آپ لوگوں کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔“ عورت ہنس پڑی۔

”میری جان کا دشمن ہے۔“ قاسم دانت پیس کر بولا۔

”پیارے بھائی کیوں خفا ہو مجھ سے۔“ حمید گھگھایا۔

”اے جاؤ..... دگا بازی والی باتیں نہ کرو..... بڑے آئے کہنے والے پیارے بھائی۔

باہر سے بھائی اندر سے قصائی..... لگایا کرو جھوٹ موٹ میرے جی کو۔“

”کیا جھوٹ بات کہی ہے..... پیارے بھائی میں نے۔“

”ابے تو قیام یہ سچ ہے کہ میری شادی ہوئی ہے۔“ قاسم نے جھلائے ہوئے لہجے میں

کہا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاموش اپیل تھی۔

”تم تو مذاق کا بُرا مان جاتے ہو۔ ابھی تو تمہارے والد صاحب کی بھی شادی نہیں ہوئی۔

تمہاری کہاں سے ہو جائے گی۔“

”والد صاحب کی بھی نہیں ہوئی۔“ عورت ہنس پڑی۔

”مطلب یہ کہ بیوی ہو کے مرنے کے بعد انہوں نے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔

کہتے ہیں پہلے بچے کی ہو جائے پھر میں کروں گا۔“

”اچھا.....!“ عورت سر ہلا کر بولی اور قاسم بے حد ہشاش بشاش نظر آنے لگا اور آنکھوں

میں آنکھوں میں حمید کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

”آپ کا مشغلہ کیا ہے؟“ عورت نے حمید سے پوچھا۔

”یہ..... یہ..... تو.....!“ قاسم شاید تعارف کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اُس کا جملہ پورا

ہونے سے پہلے ہی حمید بول اٹھا۔ ”کمیشن ایجنٹ ہوں ایک فرم کا۔“

”بہت بڑے کمیشن ایجنٹ۔“ قاسم نے سر ہلا کر تائید کی اور حمید نے اطمینان کی سانس

لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک قاسم نے اس کے بارے میں عورت کو کچھ نہیں بتایا۔

”پتہ نہیں..... نیچے کیا ہو رہا ہے۔“ عورت نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

”چلے چل کر دیکھیں۔“

”اب یہیں بیٹھے رہو۔“ حمید بولا۔ ”دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ پولیس ریوالور کے

لئے جامہ تلاشیاں لے رہی ہوگی اور اب شاید کمروں کی بھی تلاشی لی جائے۔“

”تم نے بند کرائے ہیں دروازے۔“ قاسم نے پوچھا۔

”عقل کے ناخن لو..... میں کیوں بند کراتا۔“

”ارے ہاں..... تو بہ..... ہی ہی ہی ہی..... بھول جاتا ہوں کہ تم کمیشن اینٹ ہو۔“

”اگر کمروں کی بھی تلاشی لی جائے گی تو پھر مجھے اپنے ہی کمرے میں ہونا چاہئے۔“

عورت بولی۔

”بالکل..... یہی میرا بھی خیال ہے.....!“ حمید نے کہا۔

”برابر ہی میں تو ہے ان کا کمرہ.....!“ قاسم ہنس کر بولا۔

عورت تیزی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ حمید مضحکہ انداز میں قاسم کی طرف دیکھتا رہا۔

قاسم کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب رویا اور تب رویا۔

آخر کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”حمید بھائی..... میں تمہارا گلام ہوں..... مجھے

جندہ رہنے دو گئے یا نہیں۔“

”جگ جگ جیو میرے لال..... تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری زندگی کا خواہاں ہوں۔“

”پھر یہ سب کیا ہے۔“

”بہتر ہوگا کہ تم کاؤنٹر کلرک سے معلوم کر لو..... میں یہاں پہلے سے مقیم ہوں۔“

”تو پھر یہ بھی تو ظلم ہی ہوا نا کہ اقلیلے اقلیلے چلے آئے۔“

”میں ڈیوٹی پر ہوں۔ لیکن اگر تم نے میرے بارے میں اپنی محبوبہ کو کچھ بتایا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”الاقسم میں نے کچھ بھی نہیں بتایا..... چغد تھوڑا ہی ہوں۔“

”اُس نے تو ضرور پوچھا ہوگا کہ آخر تم مجھے منحوس کیوں سمجھتے ہو۔“

”بس غلطی سے نکل گیا تھا زبان سے؟“

”کیا نکل گیا تھا۔“

”یہی کہ تم کھفیہ پولیس کے آدمی ہو۔“

”تب پھر کیا باقی چھوڑا تم نے ڈیوٹی۔“

”اے نام تھوڑا سی بتایا ہے..... نام پوچھا تھا..... میں نے کہہ دیا عبدالغفور.....!“

”حالانکہ میرا نام عبدالرشید ہے۔“

”ایک میں عبدل ایک میں عبدر..... ٹھیکے سے..... دینا جائے گا۔“

”کیا دیکھا جائے گا۔“

”کہہ دوں گا کہ اُسے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں نے تو عبدالرشید کہا تھا۔“

”دوستی زیادہ پرانی نہیں معلوم ہوتی؟“

”بس آج ہی ملاکات ہوئی ہے۔“

”خدا کرے تمہارا یہ رومان کامیاب ثابت ہو۔“

”سچے دل سے کہہ رہے ہو حمید بھائی۔“ قاسم نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

”بالکل..... میں تمہارے لئے بہت مغموم رہتا ہوں۔“

قاسم نے شدت جذبات سے بے قابو ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور انہیں بے

تحمشاہ چومتا رہا۔

”اے..... بے یہ میں ہوں۔ حمید..... وہ تو کب کی جا چکی ہے۔“

”حمید بھائی..... الا قسم..... دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی ہمدرد نہیں دینائی دیتا۔ قمی قہمی

سوچتا ہوں قاش تم ہی میرے باپ بھی ہوتے۔“

”خیر..... خیر..... میں کوشش کروں گا۔ اس بار تمہاری زندگی سدھر جائے۔“

”حمید بھائی..... وہ بھی تو قچھ قچھ..... یعنی کہ.....!“

”میں سمجھ گیا..... وہ بھی تم پر مر مٹی ہے..... کیوں.....؟“

”یکین کرو..... تمہارے آنے سے پہلے کہہ رہی تھی کہ اگر واقعی تمہاری شادی نہیں ہوئی

تو میں تمہیں اپنے ڈیڈی سے ملاؤں گی۔“

”تب تو وہ مارا.....؟“

”ہے نا.....!“ قاسم کی باچھیں کھل گئیں۔ آنکھیں اس طرح چمکنے لگی تھیں جیسے پورے

جسم کی قوت ان میں کھنچ آئی ہو۔

حمید کچھ نہ بولا۔ قاسم بھی کہتا رہا۔ ”یار اس دن میرے ستارے بڑے شاندار تھے۔ جب میں نے اُسے آرکچو میں دیکھا تھا۔ میری میز کے قریب ہی والی میز پر بیٹھی تھی۔ دو ایک بار نظریں ملی تھیں اور ہائے..... حمید بھائی کیا پوچھتے ہو..... دل تھا کہ یوں یوں..... یوں۔“

یہاں قاسم نے دل کی حالت ہاتھوں سے بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اچھا تو پھر.....!“ حمید نے پوچھا۔

”اُس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ کل آٹھ بجے والی ٹرین سے رام گڈھ جائے گی۔ تنہا سفر کرنا پڑے گا اس لئے اس کا دل گھبرا رہا ہے۔ بوڑھی عورت اُسے سمجھانے لگی تھی کہ ڈرنے کی بات نہیں۔ اکثر عورتیں تنہا سفر کرتی ہیں۔ میں نے اپنے دل میں قہار گز نہیں..... وہ تنہا سفر نہیں کرے گی۔ میں بھی اس کی دغ بھال کے لئے اُسی ٹرین سے سفر کروں گا۔“

قاسم خاموش ہو کر مسکرایا اور آنکھ مارنے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں آنکھیں ”مر کر رہ گئیں“ وہ صرف ایک آنکھ بند کر لینے پر قادر نہیں تھا۔ ساتھ ہی دوسری بھی بند ہو جاتی تھی۔

حمید نے ہونٹ بھیج کر سر کو جنبش دی اور قاسم کو تیز نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم وہیں سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے آئے ہو۔“

”اور یہ دیکھو کہ ٹھیک اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں اُسے آنا تھا۔“

”غالباً اُس نے بوڑھی عورت سے یہ بھی بتایا ہوگا کہ وہ رام گڈھ میں کہاں ٹھہرے گی۔“

”مطلق بتایا تھا۔ ورنہ میں سیدھا یہیں کیسے چلا آتا۔ بولو کیسی رہی..... اب بھی مانتے ہو میری کھوپڑی کو یا نہیں۔ اس طرح پیچھا کیا کہ پتہ ہی نہ چل سکا۔ اس کو اور اب سمجھتی ہے کہ ہم دونوں بس اتفاق سے مل بیٹھے ہیں۔“

”یقیناً..... یقیناً.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”تمہاری کھوپڑی لا جواب ہی نہیں بلکہ بے

حساب ہے۔“

”ہے نا.....!“ قاسم اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔

”لیکن.....!“ یک یک حید منموم نظر آنے لگا۔

”یقین و یقین کچھ نہیں۔ سالے حید بھائی گھپا نہ کرو.....!“

”تم سمجھتے نہیں۔ اس کی طرف سے نہیں بلکہ تمہاری طرف سے تشویش ہے مجھے۔“

”ٹھیکے پر گئی تمہاری تفتیش و قیاس.....! میں سمجھائے دیتا ہوں ہاں۔“

”اے تفتیش نہیں..... تشویش.....!“

”کیا فرق پڑتا ہے..... پہلے تشویش..... پھر تفتیش..... سالے ہزار کیڑے نکال کر رکھ دو

غے..... میں تجھ نہیں سنوں غا.....!“

”تمہارے بھلے کو کچھ کہنے جا رہا تھا۔ نہیں سننا چاہتے تو جہنم میں جاؤ۔“ حید اٹھتا ہوا بولا۔

قاسم نے اُسے روکا نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا چلا آیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ اُس نے

اپنے کمرے کی راہ لی۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اُسے یقین تھا

کہ وہ خانہ تلاشی لینے والے ہی ہوں گے۔

لیکن دروازہ کھولنے پر اُسے حیرت ہوئی۔ وہ مریا تھی۔ قاسم کی نئی دریافت۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ اُس نے کہا۔

”ضرور..... ضرور.....!“

”ناوقت تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں.....!“

”تشریف رکھئے..... میرے لئے وقت اور ناوقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ رام گڈھ

آنے کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے معمولات زندگی سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔“

”دیکھئے جناب..... آپ کا اندازہ غلط نکلا۔ وہ لوگ تو نیچے ہی پوچھ گچھ کر کے واپس چلے

گئے۔ کمروں کی تلاشیاں نہیں ہوئیں۔“

”میرا تو یہی خیال تھا۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ تو کیا وہ لوگ چلے گئے۔“

”جی ہاں..... گئے..... ریکریٹشن ہال کی ایک کھڑکی پر انہوں نے تازہ خون کا دھبہ دیکھا تھا۔ دوسری طرف دیوار پر بھی خون کی کچھ چھینٹیں ملی ہیں۔ باہر کچھ دور تک کہیں کہیں کہیں خون کے دھبے ملے..... اُس کے بعد پھر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اُن کا خیال ہے کہ زخمی ہونے والا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔“

حمید نے جمائی لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔
 ”یہاں آئے دن یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔“

”ہوتا ہوگا..... مجھے کیا۔“

”آپ ان کو کب سے جانتے ہیں۔“

”کن صاحب کو.....؟“

”میرا مطلب ہے قاسم صاحب کو۔“

”بہت دنوں سے۔“

”کیا سچ مچ اُن کی شادی ہو گئی ہے۔“

”نہیں..... وہ تو میں اُسے چھوڑتا رہا تھا۔ کسی کی شامت آئی ہے جو اسے بیٹی دے گا۔“

”کیوں..... کیا.....؟“

”ارے گنگال ہو جائیں گے سرال والے، اگر ایک وقت بھی اسے کھانا پڑا۔“ وہ ہنس دی۔

”آپ کب سے جانتی ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”آج یہیں ملاقات ہوئی ہے۔ سچ پوچھئے تو ان کی خوراک ہی نے مجھے ان کی طرف

متوجہ کیا تھا۔“

”پھر اب کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ پیڑا آدمی کی دوستی سے یہ اچھا ہے کہ آدمی بھیتی باڑی کو ذریعہ معاش بنائے۔“

”میرا کیا بگڑتا ہے اگر کوئی بیٹو ہے؟“

”معمولی جسامت کی لڑکیاں اُس سے خوف کھاتی ہیں۔ اسی لئے اب تک اس کی شادی نہیں ہو سکی۔“

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے؟“

”یہ تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ وہ کتنا سیدھا سادھا آدمی ہے۔“

”میں تو انہیں آدمی سمجھتی ہی نہیں۔ وہ صرف سیدھے سادھے ہیں۔“

”آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں۔“

”جہاں سے قاسم صاحب آئے ہیں۔“

”اوہو..... تو ساتھ ہی آئے ہیں آپ دونوں۔“

”میرا اندازہ تو یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ہی ٹرین سے آئے ہیں۔“

حمید نے پھر جمائی لی اور اکتائے ہوئے انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

ٹھیک اُسی وقت کسی نے پھر دروازے پر دستک دی۔

”کم ان.....!“ حمید کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں کسی نے دروازے کو نہ صرف دھکا دیا بلکہ بے تحاشا کمرے میں گھستا

چلا آیا۔

قاسم کے علاوہ اور کون ہوتا؟ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے اُن دونوں پر نظر ڈالی اور

کسی بات کی طرح ایک ہی جگہ پر استادہ ہو کر رہ گیا۔

اب وہ بلیکس جھپکائے بغیر حمید کو گھورے جا رہا تھا۔

اور حمید کا یہ عالم تھا کہ پینترہ بدلنے کے لئے تیار۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس طرح

بگڑے ہوئے ہاتھی کو قابو میں لانا مشکل ہوتا ہے اُسی طرح قاسم کی ذہنی رو بہک جانے کے

بعد اس کا سنبھالنا بھی کارے دارد.....!

دفعۃ حمید نے ثریا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ خود دیکھئے۔ کون کہہ سکے گا کہ یہ شخص ابھی

تک کنوارا ہے؟ جو دیکھتا ہے شادی شدہ سمجھتا ہے؟“

قاسم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر عجیب شرمیلی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔
ساتھ ہی ایک انگلی بھی دانتوں میں جادبی۔

”اب دیکھئے“ حمید پھر بولا۔ ”اس میں تو ایک کنواری پردہ نشین میں کیا فرق باقی رہا ہے۔“
ثریا ہنس پڑی اور حمید نے قاسم سے کہا۔ ”میں انہیں بہت دیر سے باور کرانے کی کوشش
کر رہا ہوں کہ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ میں نے تو محض چھیڑنے کے لئے اپنی کسی آپا
جان کا تذکرہ کیا تھا۔“

”تو میں کیا جانوں۔“ قاسم نے بدستور دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے اور نظریں نیچی
کر کے کہا۔

”اب یہ دیکھئے“ حمید دانت پر دانت جما کر بولا۔ ”اگر میری شادی نہ ہو گئی ہوتی تو یہ
خود اُس سے شادی کر لیتا۔“

”قاسم بالکل لوٹڑیوں ہی کے سے انداز میں ”کھی کھی کھی“ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔
ثریا دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے بُری طرح ہنس رہی تھی۔
ادھر حمید نے ایسی سنجیدگی اختیار کر رکھی تھی جیسے ابھی اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے آیا
ہو۔ ثریا ہنستی رہی۔ بدقت خاموش بھی ہوئی تو کافی دیر تک پیٹ دبائے بیٹھی رہی۔
”یہ آپ کو کیا سوچھی تھی۔“ آخر اُس نے حمید سے پوچھا۔

”یہی حربہ..... وقت پر کار آمد ثابت ہوا تھا۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”اگر وہ پہاڑ غصے میں مجھ پر آ پڑتا تو کیا ہوتا..... یہ بھی سوچا آپ نے۔“

”لیکن یہ شادی وادی کی بات کیوں چھیڑی تھی آپ نے۔“

”پہلے بھی مجھ پر خفا ہوتا رہا تھا کہ میں نے ایک غلط بات آپ کے سامنے کیوں کہہ دی۔“
”بھلا مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ان باتوں سے۔“ ثریا نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”آپ کو ہو یا نہ ہو دلچسپی لیکن وہ تو ہر اُس عورت پر عاشق ہو جاتا ہے جو اس کی خوراک کے بارے میں اُس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی ہو۔“

”آپ کو شرم آئی چاہئے۔ اتنی بے تکلفی سے آپ اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”بے تکلفی کے بغیر کسی قسم کی بھی باتیں نہیں ہو سکتیں۔“

”مجھ سے غلطی ہوئی جو آپ کے پاس آئی.....!“ وہ پیرنچ کراٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ کی مرضی۔“ حمید نے جمائی لے کر لاپرواہی سے کہا۔

وہ چلی گئی۔ حمید نے دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ کر دیا۔

گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پھر اُس نے سوٹ سمیت بستر پر چھلانگ لگادی۔

غشی کی طرح نیند آئی تھی اور پھر آنکھ کھلی تھی ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے۔ وہ ریسپور

اٹھا کر ماؤتھ پیس میں دھاڑا تھا۔

”مسٹر عبدالرشید.....!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”ہاں..... کون ہے؟“

”پولیس ہیڈ کوارٹر پلیز..... ایس بی کوئٹنر.....!“

”اچھا.....!“ حمید نے کہا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر ریسپور

کریڈل پر پٹخ دیا۔

شکار شکاری

رام گڈھ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں حمید مونا کا بیان لے رہا تھا۔ تین مختلف اسٹینو گرافرز

اسے لکھتے جا رہے تھے۔ یہ بیان وہاں تک قطعی صحیح تھا جہاں سے فریدی نے اُن لوگوں پر قبضہ کیا

تھا اور میجر سعید یعنی حمید کے ہاتھ پیر باندھ کر اس نامعلوم آدمی کی گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا اور

مونا کو اس نے اپنے پاس ہی بٹھایا تھا۔

”پھر.....!“ مونا طویل سانس لے کر بولی۔ ”گاڑیاں چل پڑی تھیں۔ میجر سعید پچھلی سیٹ پر پڑا ان لوگوں کو بے تحاشہ گالیاں دے رہا تھا۔ پھر شاید چار پانچ ہی میل گئے ہوں گے کہ اچانک چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ پہلے ہی پہلے ہی ہماری گاڑی کے دو وہیل بیکار ہو گئے۔ وہ آدمی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی روکی تھی اور ڈھلان میں کود گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے میجر سعید کی چیخ بھی سنی تھی۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ میری سیٹ کا دروازہ تو کھلا ہی ہوا تھا۔ بوکھلاہٹ میں میں بھی باہر نکل کر ڈھلان میں دوڑتی چلی گئی۔ مجھے ہوش نہیں کہ میں کتنی دور دوڑی تھی۔ بس فائروں کی آوازوں کا دھیان تھا۔ پھر میں نے خود کو ایک بالکل ہی ویران جگہ پر پایا تھا اور فائروں کی گونج بہت ہی مدہم ہو کر میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے بعد میں سارا دن انہیں چٹانوں میں بھٹکتی رہی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے پولیس پارٹی مل گئی اور اب میں یہاں ہوں۔“

حمید کو فریدی کی ہدایت یاد آئی اور اس نے بیان پر جرح نہیں کی۔

ایس پی کرائمر کے آفس میں یہ بیان لیا گیا۔ حمید پر ٹھکر انداز میں ایس پی کرائمر کی طرف دیکھتا رہا۔

دفعتاً ایک آدمی کچھ ٹیلی پرنٹڈ چٹس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور انہیں ایس پی کی میز پر رکھ کر چلا گیا۔

حمید نے اُسے تیز نظروں سے دیکھا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ ایس پی جو اُن چٹوں کو دیکھ رہا تھا سراسر اٹھا کر بولا۔

”اوہ..... آپ کے لئے پیغام ہے۔“

پھر اُس نے ان چٹوں کو بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ پیغام فریدی کی طرف سے تھا۔ حمید کو ہدایت دی گئی تھی کہ پیغام موصول ہوتے ہی وہ مونا سمیت دھام نگر کیلئے روانہ ہو جائے۔ حمید نے طویل سانس لی اور مونا کی طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے کہیں بھی جانا ہو۔“ مونا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے پرواہ نہیں۔ لیکن خدا را

ایک نظر ڈیڈی کو دیکھ لینے دیجئے۔“

”ڈیڈی..... کیا مطلب.....!“

”کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میرے ڈیڈی ہسپتال میں بیہوش پڑے ہیں۔“

”اوہ..... محترمہ..... مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ باس کے پیغام

میں ایسی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے۔“

”میں انسانیت کے نام پر آپ سے التجا کرتی ہوں؟“

”کیا حرج ہے کیپٹن.....!“ ایس پی بولا۔ ”ہسپتال راستے ہی میں پڑے گا۔ میری

دانت میں تو آپ کو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

”آپ نہیں سمجھ سکتے.....!“

”آپ کی مرضی.....!“ ایس پی کالجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔

”کیوں.....؟“ حمید چونک کر بولا۔ ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایسا کیا جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ خود ہی لڑکی کے لئے ہمدردی محسوس کریں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن..... خیر آپ کہتے ہیں تو دو چار منٹ کے لئے ہسپتال میں رک

جائیں گے۔“

مونا نے گلوگیر آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

ایس پی صاحب اب حمید کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن حمید کی نظریں اُسی کے

چہرے پر تھیں۔

دفعتاً اس نے کہا۔ ”کیا ان چٹوں میں صرف اتنا ہی سا پیغام ہے۔“

”ہمارا ریسوننگ سیٹ ان دنوں کچھ گڑبڑایا ہوا ہے۔“ ایس پی بولا۔ ”لہذا غیر ضروری

حروف بھی چھاپ ڈالتا ہے..... یہ دیکھئے۔“

اس نے پریئنڈ چٹس حمید کی طرف بڑھا دیں۔ حمید انہیں بغور دیکھتا رہا۔ غیر ضروری

حروف بھی تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ایک پوشیدہ پیغام اور بھی تھا جسے ایس پی نے غیر ضروری حروف کے زمرے میں شامل کر کے نظر انداز کر دیا تھا۔

فریدی نے اپنے وضع کئے ہوئے کوڈ میں اُسے مطلع کیا تھا کہ وہ ایس پی سے ہوشیار رہے۔
 ”واقعی.....!“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”آپ لوگوں کو بڑی دشواری پیش آتی ہوگی۔ مرمت کیوں نہیں کراتے اس کی۔“

”کئی بار ہو چکی ہے..... اب ایجنسی کا خیال ہے اس کی جگہ دوسرا سیٹ لگا دے۔“
 حمید نے سر کو جنبش دی اور گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا مونا سے بولا۔ ”تو چلے۔“
 ”اگر آپ کسی اور کو بھی ساتھ لے جانا چاہیں تو.....!“

”نہیں شکریہ۔“ حمید نے ایس پی کی بات کاٹ دی۔ ”اگر یہ ضروری ہوتا تو پیغام میں اس کی وضاحت ہوتی۔“
 ”آپ کی مرضی.....!“

پھر حمید مونا سمیت اپنی اس ٹوسیٹر میں آ بیٹھا جس میں دو کی بجائے چار دروازے تھے اور وہ ایک میکنزم کو حرکت میں لانے سے فور سیٹر کنورٹبل بھی بن سکتی تھی۔
 پچھلے دروازوں میں باہر کی طرف ہینڈل نہیں تھے۔

مونا اپنی جانب والی کھڑکی پر جھک گئی۔ حمید نے انجن اسٹارٹ کیا۔ گاڑی جھکے کے ساتھ آگے بڑھی اور مونا بایاں پہلو دبائے سیدھی بیٹھ گئی۔
 ”کیوں..... کیا بات ہے۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”میرا دل کمزور ہے..... اور آپ کو گیر بدلنے کا سلیقہ نہیں۔“
 ”مجھے افسوس ہے۔“

پھر ہسپتال تک کا راستہ خاموشی سے طے ہوا تھا۔ ان کی گاڑی کپاؤنڈ میں داخل ہی ہوئی تھی کہ ایک جیپ بھی اُن کے برابر ہی رکی۔

”ہوں.....!“ حمید نے ہونٹ بھیج کر طویل سانس لی۔

پھر قبل اس کے مونا اور حمید گاڑی سے اترتے ایس پی کرائمر جیپ سے اتر کر سیدھا ان کی طرف چلا آیا۔

”مجھے ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر کو ہوش آ گیا ہے؟“ اس نے حمید سے کہا۔
 ”اوہ.....!“ مونا نے پرست آواز میں چیخ کر دروازے کا ہینڈل گھمانا چاہا۔ لیکن ایس پی نے باہر کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”نہیں محترمہ۔ اب آپ واپسی ہی پر ان سے مل سکیں گی۔“

”کیوں..... کیوں.....؟“

”ہوسکتا ہے کہ آپ پر نظر پڑتے ہی وہ کسی قسم کے جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو کر دوبارہ اسی ذہنی کیفیت میں نہ مبتلا ہو جائیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ایس پی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”میں بھی یہی کہوں گا کہ اس وقت آپ پروفیسر کے سامنے نہ آئیے۔ شاید ہم شام تک واپس آجائیں۔ میرا چیف غالباً اپنے طور پر جرح کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ آپ کو تکلیف نہ دی جاتی۔“

”میرے خدا میں کیا کروں۔“ مونا ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر بڑبڑائی۔

حمید نے دوبارہ انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی پھانگ کی طرف موڑ لی۔ گاڑی کا انجن زیادہ رن نہیں مچاتا تھا اس لئے وہ مونا کی ہچکیاں اور سسکیاں صاف سنتا رہا۔

اس نے سوچا بعض پیٹھے آدمی کو پتھر بنا دیتے ہیں۔ اگر وہ پتھر نہیں ہے تو کم از کم انہیں ہر تو یہی کرنا پڑتا ہے کہ وہ پتھر ہی ہیں۔

”پتھر.....!“ اس نے بڑبڑا کر طویل سانس لی۔ وہ کسی طرح اسے دلاسا دینا چاہتا تھا۔
 کیا کرتا۔ اس وقت اس کے لئے بالکل ہی اجنبی تھا۔ کیپٹن حمید! مسجر سعید کی حیثیت سے تو اس سے کسی قدر بے تکلف بھی تھا اور شاید وہ بھی اس سے گفتگو کرتے وقت اپنے ذہن کو چھوڑ دیتی تھی۔

اس نے سوچا کچھ بھی ہو وہ اُسے اس طرح نہ رونے دے گا۔ فادر ہارڈ اسٹون خواہ کچھ

کہے۔ پھر اس سے فرق بھی کیا پڑے گا۔ اگر وہ اسے بتادے کہ میجر سعید بھی خود ہی تھا۔
 ”موننی.....!“ اس نے بلا آخر اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ اور غالباً لہجے ہی کی بناء پر وہ
 نہ صرف چونک پڑی تھی بلکہ اس کی سسکیاں بھی تھم گئی تھیں۔

”موننی..... ضبط کرنے کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے حق حاصل ہے کہ میں
 تمہیں اس لہجے میں مخاطب کروں۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل ہی اجنبی نہیں
 ہیں۔“

”مم..... میں..... نہیں سمجھتی۔“ موننی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”میں میجر سعید ہوں۔“

”میجر سعید.....!“ وہ اچھل پڑی اور اسے اس طرح گھورنے لگی جیسے کسی ریچھ نے اپنے
 مہاتما ہونے کا اعلان کیا ہو۔

”لل..... لیکن آپ تو.....!“

”کیپٹن حمید! اسی ٹیم سے تعلق رکھتا ہوں جس سے سارہ رحمان ملنا چاہتی تھی۔“

”لیکن میجر سعید..... آپ دونوں کی شکلوں میں ذرا سی بھی مطابقت نہیں۔“

”اسے میک اپ کا کمال کہتے ہیں۔ میرا چیف اولڈ اسکول کے اس نصاب سے آج تک

پہچان نہیں چھڑا سکا۔“

”لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی آواز سن کر میجر سعید کی آواز یاد آئی تھی مجھے۔“

”ہمیں بعض اوقات بڑے عجیب و غریب حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لئے سبھی کچھ

کرنا پڑتا ہے۔ ہاں تو تم پولیس پارٹی کے ہاتھ کیسے لگیں۔“

”آپ کے ساتھی نے مجھے وہیں پہنچا دیا تھا جہاں پولیس پارٹی بھگتی پھر رہی تھی اور پھر

میں نے وہی سب کچھ کیا جو انہوں نے مجھے سمجھا دیا تھا۔“

”ایک بات پوچھوں؟ صحیح جواب دو گی۔“

”پوچھئے۔“

”تمہارا پہلا بیان جو تم نے میجر سعید کو دیا تھا اس سے بڑی حد تک مختلف تھا جو بعد کو تم نے میرے ساتھی کو دیا تھا اس کی کیا وجہ تھی۔“

مونا فوراً ہی کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار تھے۔ پھر یک بیک اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک نظر آئی جیسے اس نے کوئی اہم فیصلہ کیا ہو۔

”ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں اور یہ بھی سنئے کہ میں نے آپ کے ساتھی کو بھی پوری بات نہیں بتائی۔“

”اوہو..... تب تو تم نے میری عزت رکھ لی۔“ حمید بے حد خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”بھلا اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔“

”میرا وہ ساتھی دراصل میرا چیف تھا جو مجھے بالکل اُلو سمجھتا ہے۔ بڑے عجیب انداز میں مجھے دیکھتا تھا جب میں تم سے شکوہ کرتا کہ تم نے فلاں بات مجھے نہیں بتائی۔“

”اوہ تو اس کا یہ مطلب کہ وہ کنٹرل فریدی تھے۔“ مونا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں..... آں.....!“ حمید نے طویل سانس لیتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور پھر اُسے سڑک کے کنارے لگا کر روک بھی دیا۔

ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے کنجیوں کا لچھا نکلا اور اپنی طرف کے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر کنجی لگائی۔ دروازے کا اسٹر الگ ہو گیا۔ مونا حیرت سے یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ پھر ٹامی گن پر اس کی نظر پڑی جسے حمید خانے سے نکال کر اپنی گود میں رکھ رہا تھا۔

”یہ..... یہ..... کک..... کیوں.....؟“ وہ ہلکائی۔

”فکر نہ کرو۔ احتیاطاً..... آخر مجھے بھی تو سوچنا چاہئے کہ میرے چیف نے خواہ مخواہ دھام

نکر میں کیوں طلب کیا ہے؟“

”اب تو میں بھی اسی الجھن میں پڑ گئی ہوں۔“ وہ کانپ کر بولی۔ ”دیکھئے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔ کیا لڑائی جھگڑے کا امکان ہے۔ آپ کا وہ فائر مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ میں تو سمجھی تھی بس خاتمہ ہوا۔“

”وہ تو مجبوری تھی۔ اتنی شاندار ایکٹنگ کے بغیر میں کامیاب نہ ہو سکتا۔“ حمید نے کہا اور گاڑی اشارت کر کے پھر سفر شروع کر دیا۔ مونا خاموشی سے ٹائی گن کو گھورے جارہی تھی۔

”بہر حال۔“ حمید کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم نے اچھا ہی کیا.....؟“

”کیا اچھا کیا.....؟“

”یہی کہ تم نے میرے چیف کو اصل واقعات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔“

”یہ تو میں نے نہیں کہا۔ میں نے غالباً یہ کہا تھا کہ پوری بات انہیں بھی نہیں بتائی۔“

”لیکن اگر اب مجھے بتا دو تو کیسی رہے۔“

”مجھے بھی اب یہی سوچنا پڑا ہے کہ ڈیڈی سے کیا ہوا عہد توڑ دوں..... آخر کب تک

لوگوں پر اسی قسم کے مظالم ہوتے رہیں گے۔ اگر میں اب بھی زبان بند رکھوں تو اسے وطن دشمنی ہی کہیں گے۔“

”بالکل.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”سارہ کے پرس کا راز میں نے آپ کے چیف کو بتا دیا تھا.....!“

”ہاں..... وہ تو میرے سامنے ہی.....!“

”جی نہیں..... وہ تو اس کی اہمیت بتائی تھی۔ راز اب آپ کو بھی بتا دوں گی۔ قاتل چمڑے

کے دستانے پہنے ہوئے تھا۔ واجد سے کشمکش کے دوران میں داہنے ہاتھ کا دستانہ اتر گیا تھا۔ پھر

اس پر قابو پانے کے بعد اس نے اسی ننگے ہاتھ سے چاقو نکال کر اس کا زرخرہ کاٹ دیا۔ اس کا وہ

ہاتھ خون سے تر ہو گیا۔ پھر وہ بے خیالی میں وہی ہاتھ زمین پر ٹیک کر اس کی لاش پر سے اٹھا۔

جلدی میں چاقو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ سارہ جائے واردات پر موجود تھی۔ لیکن بے

دست و پا..... سہمی کھڑی رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد جب اُسے ہوش آیا تھا اور اس نے دیکھا تھا

کہ قاتل ایک پرانے اخبار پر اپنے خون بھرے ہاتھ کا نشان چھوڑ گیا ہے۔ گردہ کے لوگوں کا

خیال ہے کہ پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اسی لئے وہ اس طرح دندناتا پھرتا

ہے۔ جب جسے چاہا مار ڈالا۔ یہ ساری باتیں مجھے سارہ ہی نے بتائی تھیں۔ بہر حال سارہ کی

دانست میں اگر اس کے ہاتھ کا نشان پولیس تک پہنچ جاتا تو وہ اُسے ڈھونڈ نکالتی۔ لیکن اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اس قسم کے گروہ پولیس کا تعاون حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہذا اُسے کسی ایمان دار پولیس آفیسر کی تلاش تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اگر وہ کسی طرح کرنل فریدی تک پہنچ جائے تو اس کی یہ مشکل ضرور آسان ہو جائے گی۔ خدا اس کی روح کو سکون بخشے اس کی یہ آرزو بہر حال پوری ہوگئی۔ میں نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ واجد اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سارہ اس سے لاعلم تھی۔ جب واجد نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتی تو اس کو اسی راہ پر لگانے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ سارہ کا انڈسٹریل ہوم منشیات کی تجارت کا ذریعہ بن گیا اور سارہ ایک اعصاب زدہ لڑکی جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی۔ اُسے نفرت تھی اس کا روبار سے.....!“

سارہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ ”آخر سر گروہ نے واجد کو مار کیوں ڈالا تھا۔“

”اس کی وجہ خود سارہ کو بھی نہیں معلوم تھی۔ حادثے کی رات کو واجد کو اپنی گاڑی میں اس کے گھر پہنچانے گئی تھی۔ واجد نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کچھ دیر اس کے ساتھ ٹھہرے۔ اس نے مکان کا قفل کھولا تھا اور وہ اندر گئے تھے۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اس مقفل مکان کے اندر سیاہ پوش کو اپنا منتظر پایا۔ سارہ اس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے قصے پہلے ہی سن چکی تھی۔ لہذا اس کی موجودگی نے اُسے معمول سے زیادہ نروس کر دیا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی اور سیاہ پوش اس پر اچانک ٹوٹ کیوں پڑا تھا۔“

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔

”یہ تو بتاؤ..... آخر تمہارے ڈیڈی کا کیا معاملہ ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”یہی تو میں نے آپ کے چیف کو بھی نہیں بتایا۔“

”ہرگز نہ بتانا۔“

”کیوں.....؟“ سارہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مطلب یہ کہ اس کا علم پہلے مجھے ہونا چاہئے۔“

”کچھ دیر پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ کو بتا دوں..... لیکن اب میری سمجھ میں نہیں

آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”تمہیں ٹوئیٹ کرنا چاہئے..... غم غلط کرنے کا بہترین طریقہ.....!“

”مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا..... کچھ بھی تو نہیں..... خلاء میں جھول رہی ہوں؟ نہ پیر رکھنے کے

لئے زمین ملتی ہے نہ بازوؤں میں قوت پرواز..... میرے خدا میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔“

”میں نے تو دراصل تمہارا دھیان بنانے کی کوشش کی تھی۔“ حمید نے ہمدردانہ لہجے میں

کہا۔ ”لیکن تم خود ہی ایسے قصے کو نکال بیٹھیں۔“

”کیسے نہ نکال بیٹھتی جب کہ میں خود بھی اسی کہانی کا ایک کردار ہوں۔“

”اوہ..... میں تو تمہیں بالکل معصوم سمجھتا تھا۔“

”براہِ راست نہیں..... میں ڈیڈی کے واسطے سے اس کہانی کا کردار بنی ہوں۔ میں نے

ان لوگوں کے لئے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن ڈیڈی..... اوہ..... میں..... کیا بک رہی ہوں۔“

”دل کا غبار نکالنا بے حد ضروری ہے مونی..... ورنہ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”میں تو مر رہی جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد حمید پھر اس کی ہچکیاں اور سسکیاں سنتا اور شدت سے بور ہوتا رہا۔ وہ تو سمجھا

تھا کہ باپ کے ہوش میں آنے کی خبر سن کر وہ کسی قدر بتاش نظر آئے گی اور یہ سفر نمونہ سقر نہ

ثابت ہوگا۔

”سنو..... میری طرف دیکھو..... اب تمہیں کیا پریشانی ہے۔ تم اپنے ڈیڈی کے ہوش میں

آنے کی خبر بھی سن چکی ہو۔ ان کی حالت بہتر ہوگی۔“

”میں اُن کی زندگی نہیں چاہتی۔“ یک بیک مونا چیخ کر بولی۔ ”ان کی موت کی خواہاں ہوں۔“

”اوہ.....!“ حمید سنجیدہ ہو گیا۔

مونا کی ہچکیاں اور سسکیاں بھی رک گئیں تھیں۔ دفعتاً اس نے چیخ چیخ کر بکنا شروع کیا۔
 ”وہ ایک باعزت آدمی ہیں۔ اپنی رسوائی برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتی
 تھی کاش وہ ہوش میں آنے سے پہلے ہی مر جاتے۔ سنو۔ انہوں نے مجھے اپنی بے بسی کی
 داستان سنائی تھی اور خواہش ظاہر کی تھی کہ میں کم از کم ان کی زندگی میں اس کا تذکرہ کسی سے نہ
 کروں۔ تم مجھے ان کی موت کی خبر سنا دو۔ میں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”کاش میں تمہارے کسی کام آ سکتا.....؟ اب کچھ نہ پوچھوں گا۔“
 پھر راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ بھگی بھگی سی دھوپ چٹانوں پر بکھری ہوئی تھی اور ونڈ
 شیلڈ سے ٹکرانے والی ہوا سرد تھی۔

دفعتاً انہوں نے ہیلی کوپٹر کا شور سنا۔ بائیں جانب سے وہ سیدھا اسی طرف چلا آ رہا تھا۔
 پرواز نیچی تھی۔

”دیکھو..... یہ کدھر جاتا ہے۔“ حمید نے مونا سے کہا۔
 گاڑی اس سے آگے نکل آئی تھی۔ مونا نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا اور بولی۔ ”ٹھیک
 ہمارے پیچھے ہے۔“

”میرا چیف غافل نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اوپر سے ہماری دیکھ بھال ہو رہی ہے۔“ حمید نے کہا اور مزید کچھ کہنے والا تھا کہ ایک
 زوردار دھماکہ ہوا۔ گاڑی کو دھچکا سا لگا اور حمید بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرے خدا.....
 یہ تو بلاسٹ تھا۔“

ایکسیلرٹر پر مزید دباؤ غالباً اس دھچکے ہی کا نتیجہ تھا اور گاڑی کی رفتار غیر ارادی طور پر
 بڑھ گئی تھی۔

پھر تو وہ رفتار بڑھاتا ہی گیا۔ ایک دھماکہ پھر ہوا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ مونا کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”فکر نہ کرو۔ میرا چیف اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کا مذاق کرے۔ یہ ہیلی کوپٹر ہمارے دشمنوں ہی کا ہو سکتا ہے۔“

”اب کیا ہوگا..... یہ تو..... یہ تو.....!“

”تیسرے دھماکے نے مونا کا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔“

”واقعی شامت ہے۔ نہ گاڑی روک سکتا ہوں اور نہ اس رفتار سے چل ہی سکتا ہوں۔

کیونکہ آگے موڑ ہی موڑ ہیں..... المددیارب السموات..... المدد.....!“

ٹھیک اُسی وقت کسی طیارے کی آواز پھر سنائی دی اور اب کے گاڑی کے قریب اس زور کا دھماکہ ہوا کہ اسٹیرنگ پر حمید کے ہاتھ بہک گئے۔ لیکن ساتھ ہی بریک پر بھی پیر پڑا اور گاڑی سڑک کے نیچے اتر کر ایک چٹان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ دوسری طرف بھی اگر قد آدم چٹان ہوتی تو اس رفتار پر اچانک بریک لگنے پر گاڑی الٹ ہی جاتی۔

حمید کو اتنا ہوش تھا کہ بریک پر دباؤ کم کئے بغیر انجن بند کر دیتا۔

ہیلی کوپٹر ان کے سروں پر سے گزر گیا۔

”مونا..... مونا.....!“ حمید اُسے جھنجھوڑ کر بولا۔ ”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“

مونا کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہو۔

حمید نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور تیزی سے نیچے اتر آیا۔ ٹامی گن بھی اس کی گود سے نکل کر باہر گری تھی۔

اب وہ مونا کی بظلوں میں ہاتھ دے کر اسے بھی نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہیلی کوپٹر کچھ دور جا کر پھر ان کی طرف مڑا۔ اس بار اس کی پرواز پہلے سے بھی نیچی تھی۔

حمید نے سوچا اب خیریت نہیں۔ مونا بیہوش ہو گئی تھی اور اس نے اُسے اپنے ہاتھوں پر سنبھال رکھا تھا۔

”اوہو..... یہ..... یہ.....!“ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ اس نے ایک طیارے کو

ہیلی کوپٹر پر ڈائیو کرتے دیکھا اور پھر وہ اس پر فائرنگ کرتا ہوا اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ ہیلی کوپٹر کا رخ مڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ طیارے کی زد سے بچ نکلنا چاہتا ہو۔ طیارے نے چکر کاٹ کر پھر اس کے اوپر غوطہ لگایا لیکن اس بار فائرنگ نہیں کی۔

اب حمید نے ہیلی کوپٹر کو ڈھلان میں اترتے دیکھا۔ وہ نیچے تقریباً تین سو فٹ کی گہرائی میں جا رہا تھا۔

حمید نے مونا کو وہیں زمین پر ڈال دیا اور ٹامی گن سنبھال لی۔ جلد ہی اس نے ہیلی کوپٹر کو لینڈ کرتے دیکھا۔

طیارہ اب بھی اوپر فضا میں چکر لگا رہا تھا۔ حمید نے مناسب یہی سمجھا کہ لینڈ کئے ہوئے ہیلی کوپٹر پر فوراً فائرنگ شروع کر دے۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ ہیلی کوپٹر میں کتنے آدمی ہیں۔ اس وقت خود حمید کی پوزیشن محفوظ تھی۔ وہ ہیلی کوپٹر کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ہیلی کوپٹر والے اس کا نشانہ نہیں لے سکتے تھے۔

ٹامی گن کے پہلے ہی ہلنے نے ہیلی کوپٹر کے سواروں کو ہیلی کوپٹر سے باہر نہ نکلنے دیا۔ حمید سوچ رہا تھا کاش مونا کو جلدی سے ہوش آ جاتا۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ نہیں سکتا تھا اور یہ ضروری تھا کہ اس کی ٹوسیٹر کے دوسرے دروازے کا پوشیدہ خانہ کھولا جاتا جس میں بہت ہی طاقتور قسم کے تین عدد دستی بم رکھے ہوئے تھے۔ دانش مندی کا تھا ضابطہ یہی تھا کہ ہیلی کوپٹر کو تباہ کر دیا جاتا۔ فضا میں چکر لگانے والا جہاز مددگار ہی سہی لیکن شاید اس میں کوئی ایسا انتظام نہیں تھا جس سے ہیلی کوپٹر پر تباہ کن حملہ کیا جاسکتا۔

حمید نے تھوڑی دیر ٹھہر کر ایک بار پھر ٹامی گن کا ٹریگر کھینچ دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور حمید نے ہیلی کوپٹر کی چھت میں سوراخ ہوتے دیکھے۔ اتنے میں مونا بھی کراہ کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہے..... یہ سب کیا ہے..... ارے یہ گاڑی..... تم کیا کر رہے ہو۔“ وہ ہڈیانی انداز میں بولتی چلی گئی۔

حمید نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”خود کو قابو میں رکھو اور ادھر میرے قریب بیٹھے بیٹھے کھسک آؤ۔ اٹھنا نہیں..... دوسری طرف دشمن ہے۔“

پھر اس نے ٹامی گن سے کچھ فائر کئے۔ وہ دراصل نہیں چاہتا تھا کہ ہیلی کوپٹر کے سوار باہر آئیں۔ باہر نکل کر وہ چٹانوں کی اوٹ لے لیتے اور پھر ان پر قابو پانے میں دشواری ہوتی۔ مونا گھسٹتی ہوئی اس تک پہنچی اور حمید نے اُسے کنجیوں کا گچھا دیتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح میں نے اپنی سائیڈ کے دروازے کا اسٹر نکال کر..... لیکن ٹھہرو..... احتیاط کی ضرورت ہے۔ تین ہینڈ گرنیز رکھے ہوئے ہیں اس خانے میں۔ ایک ایک کر کے نکال لاؤ۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے گاڑی تک جاؤ..... شاباش.....!“

”مم..... میں..... ہینڈ گرنیز..... نہیں نہیں۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”تو پھر ہم دونوں ہی جہنم رسید ہوں گے۔“ حمید جھنجھلا کر بولا اور پھر ہیلی کوپٹر پر فائر کئے۔

”جاؤ..... میں انہیں روکے ہوئے ہوں۔ اگر ہر منٹ پر فائر نہ کر سکا تو وہ ہیلی کوپٹر سے باہر نکل آئیں گے۔ پھر ہماری خیر نہیں۔“

”کک..... کوئی کنجی ہے.....؟“ مونا نے روہاؤسی آواز میں پوچھا۔

حمید نے اُسے کنجی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں..... سیفٹی کیج ہٹائے بغیر وہ پھٹ نہیں سکتے۔ خوبصورت لڑکیاں بہادر بھی ہوتی ہیں۔ دادا جان مرحوم اکثر کہا کرتے تھے۔“

مونا گھسٹتی ہوئی گاڑی تک گئی۔ خفیہ خانہ کھولا اور ایک ایک کر کے تینوں دتی بم نکال لائی۔

”ارے ادھر تو دیکھو۔“ دفعتاً سڑک کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولی۔

فضا میں ایک پیراشوٹ نظر آیا۔ کسی نے طیارے سے چھلانگ لگائی تھی اور آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔

پوزیشن ایسی تھی کہ شاید ہیلی کوپٹر والے اسے دیکھ بھی نہ سکے ہوں۔

جہاز کی پرواز زیادہ اونچی نہیں تھی۔

حمید نے لا پرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور پھر ہیلی کوپٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی

ٹامی گن پھر گولیاں اگل رہی تھی۔

ہیلی کوپٹر سے نہ تو فائرنگ ہی ہوئی اور نہ اس کا انجن ہی جاگا..... حمید نے ٹامی گن رکھ دی اور ایک دستی بم کا سیفٹی کچھ ہٹانے ہی لگا تھا کہ مونا چیخی۔ ”ارے وہ ادھر ہی آرہا ہے۔ زمین پر آ گیا۔“

حمید نے مڑ کر دیکھا..... نہ صرف دیکھا بلکہ اپنی طرف دوڑ کر آنے والے کو پہچانا بھی۔ یہ کرنل فریدی تھا۔

”وہ ہاتھ اٹھائے کہہ رہا تھا۔“ ”اوہ احمق یہ کیا کر رہے ہو۔ سارا کھیل بگاڑ دو گے۔ خبردار..... گرنیڈ مت پھینکنا۔ ساری محنت برباد ہو جائے گی۔“

حمید نے طویل سانس لی اور ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

آخری دھماکہ

فریدی اس وقت میک اپ میں نہیں تھا۔ اس نے جھک کر چٹخی ہوئی چٹان کی دراڑ سے دوسری طرف دیکھا۔ ہیلی کوپٹر جوں کا توں وہیں موجود تھا۔

”میں نے ابھی تک کسی کو بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔“ حمید نے گردن اکڑا کر کہا۔ ”اور اب اُسے تباہ کرنے جارہا تھا۔“

مونا حیرت سے آنکھیں پھاڑے فریدی کو دیکھ رہی تھی۔ یہی شخص اوپر چکرانے والے طیارے سے کودا تھا۔ کون ہے یہ..... جو کیپٹن حمید سے اس انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔

”تم سے حماقت سرزد ہوئی۔“ فریدی نے بدستور دراڑ سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ذرا ایک گرنیڈ مجھے دینا۔“

حمید نے ایک دستی بم اُسے تھما دیا۔ اس کی نظر ہیلی کوپٹر ہی پر تھی۔ وہ فریدی کی طرف

نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے ہم پھینکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن اُسے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے فریدی کا نشانہ خطا کرتے دیکھا۔ ہم ہیلی کوپٹر سے کافی فاصلے پر گرا تھا۔ اتنا فاصلہ تھا دونوں کے درمیان کہ وہ دھوئیں میں بھی نہ چھپ سکا۔

دوسرے ہی لمحے میں اس نے دو آدمیوں کو ہیلی کوپٹر سے باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ دونوں خاکی لباس میں تھے لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی بناء پر ان کے خدوخال واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

”ٹوپسن مجھے دو۔“ فریدی نے کہا اور ٹامی گن اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ دونوں ایک چٹان کی اوٹ لینے ہی والے تھے کہ فریدی نے ان سے کچھ دور ہٹا کر فائر کئے۔ وہ اچھل کر دوسری طرف بھاگے۔

”میگزین.....!“ فریدی غرایا اور پھر ٹریگر دبا دیا۔

حمید گاڑی کی طرف جھپٹا۔ ٹامی گن والے خانے سے مزید میگزین نکالا اور ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے ٹیلی سکوپ بھی نکالتا ہوا پھر فریدی کی طرف پلٹ آیا۔ فریدی تھوڑے تھوڑے وقفے سے برابر فائر کئے جا رہا تھا۔ حمید نے قریب پہنچ کر پوزیشن دیکھی اور اب اس فائرنگ کا مقصد اس کی سمجھ میں آ گیا۔

فریدی انہیں دوڑا دوڑا کر تھکا رہا تھا۔ جب بھی وہ کسی جانب بڑھتے فریدی اسی رخ پر ان سے کچھ دور فائر کر کے ان کا منہ پھیر دیتا۔ وہ دوسری طرف بھاگتے اور ادھر بھی ان کا یہی حشر ہوتا۔ ان میں سے ایک کا تو یہ حال تھا کہ گر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح وہ دونوں ہیلی کوپٹر سے کافی دور نکل آئے تھے۔

”تم ہیلی کوپٹر کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”یقیناً.....!“

”تمہارے پاس صرف دو بم ہیں۔ میں تمہاری مہارت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تباہ کر دوں.....؟“

”ہاں..... کیونکہ میں کچھ دیر اس مردود کے رقص سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔“

حمید کا پھینکا ہوا پہلا ہی بم ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔

موتا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لیکن اس وقت شاید وہ دونوں ہی اُسے بھولے ہوئے تھے۔

بالآخر وہ گھسنتی ہوئی گاڑی تک گئی اور اس سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر ہیلی کوپٹر سے دھوپیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک دھماکہ اور ہوا۔

یہ پہلے دھماکے سے کہیں زیادہ زوردار تھا۔ غالباً اس کا آئیل ٹینک پھٹا تھا۔

نیچے پناہ تلاش کرنے والے اوندھے منہ زمین پر گر گئے تھے۔

حمید نے دور بین کے شیشے ایڈجسٹ کئے اور ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ دفعتاً ان میں سے

ایک کہنیاں ٹیک کر اٹھتا ہوا نظر آیا۔

”اوہ..... اس کے چہرے پر تو خاکی نقاب ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ ہیں۔ بقیہ چہرہ بالکل چھپا ہوا ہے۔“

”اسی لئے مجھے افسوس ہوتا اگر تم میرے پہنچنے سے قبل ہیلی کوپٹر کو تباہ کر دیتے۔“ فریدی

نے کہا۔

”تو آپ جانتے تھے کہ وہ ہیلی کوپٹر میں موجود ہے۔“

”گمان غالب تھا کہ اس بار یہی ہوگا۔ اس کے تحت کام کرنے والے تو لڑکی پر ہاتھ نہیں

ڈال سکتے تھے اور وہ پھر نکل بھاگنے کی فکر میں ہے۔“

فریدی نے خاموش ہو کر فائر کئے لیکن اس بار بھی گولیاں اس سے کچھ دور ہٹ کر پڑی

تھیں۔ وہ بوکھلا کر دوسری طرف مڑا اور پھر گر پڑا۔

دوسرا آدمی تو پہلے جہاں گرا تھا وہاں سے جہنم بھی نہیں کر سکا تھا۔

”کیا دوسرا مر ہی گیا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔ ”ہیلی کوپٹر کے ٹکڑے دور دور تک پھیلے تھے۔“

”وہ پھر اٹھ رہا ہے۔“ حمید نے آنکھوں سے دور بین لگائے ہوئے کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ٹریگر پھر کھینچ دیا۔ کئی گولیاں نقاب پوش کے قریب ہی گریں اور وہ دوبارہ زمین سے چپک گیا۔

”تکب تک یہ کھیل جاری رہے گا۔“ حمید نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ مونا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ کئی دھماکے سنے ہیں اس لئے بیہوش ہو گئی ہے۔“

اب حمید کو مونا یاد آئی اور وہ گاڑی کی طرف مڑا۔ مونا کے ہاتھ ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے اور وہ گاڑی سے کئی نیم دراز تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور دانت اتنی سختی سے بھینچے ہوئے تھے کہ جڑوں کی رگیں ابھری ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن وہ اُسے ہوش میں کیسے لاتا۔ منہ پر چھینٹے دینے کے لئے پانی تک تو تھا نہیں۔ بس احمقوں کی طرح شانہ ہلا کر اُسے آوازیں دیتا رہا۔

فریدی نے اس دوران میں مزید دوبارہ فائر کئے تھے۔

”میں اُسے کس طرح ہوش میں لاؤں.....!“ حمید کچھ دیر بعد منمنایا۔

”اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ مردود..... کہیں پھر نہ نکل بھاگے۔“

”کیا مطلب.....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”اور کیا پہلے بھی کبھی بھاگا تھا۔“

”کیا تمہیں یاد نہیں؟“

”کیا یاد نہیں۔“

”زیادہ دن تو نہیں گزرے حمید صاحب۔ یادداشت پر زور دو۔“

”فی الحال ذہن اس قابل نہیں۔ میں اُسے ہوش میں کیسے لاؤں۔“

”چھوڑ دو..... خود ہی ہوش میں آئے گی۔“

حمید پھر اس چٹان کی طرف پلٹ آیا جس کی دراز سے وہ دوسری طرف دیکھ سکتا تھا۔ دور بین آنکھوں کے قریب آئی۔

”اوہو..... کیا یہ بھی چل بسا۔“ اس نے کہا۔

”ہاں..... دیر سے نہیں اٹھا۔“ فریدی بولا۔ ”غالباً سمجھ گیا ہے کہ حملہ آور اُسے ہلاک نہیں

کرنا چاہتا۔“

”تو پھر.....؟“

”سلاح بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حربہ دور تک مارنے والا نہیں ہو سکتا۔“

”یہ کس بناء پر کہہ سکتے ہیں آپ.....!“

”اگر یہ بات نہ ہوتی تو کچھ نہ کچھ میگزین اس نے بھی ضائع کیا ہوتا۔“

”ارے تو ہاتھ کیسے آئے گا۔“

”جاؤ پکڑ لاؤ..... سر ڈالے اوندھا پڑا ہوا ہے۔“ فریدی نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اوہ..... تو اس کا یہ مطلب کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب ہم قریب

پہنچیں گے تو اچانک فائرنگ شروع کر دے گا۔“

”سوچے جاؤ بچوں کی طرح۔ ایک لڑکی کے ساتھ سفر کرتے رہے ہوتا.....!“

”سفر زندگی کی ابتداء بھی ایک لڑکی ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔“

”اچھا بر خوردار بس یہ بات یہیں ختم کر دو۔ ورنہ تم یہ بھول جاؤ گے کہ کہاں ہو۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ بُرا سامنہ بنائے ہوئے نشیب میں دور بین کو گردش دیتا رہا۔

ملزم بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا۔ حمید نے سوچا ممکن ہے آخری بار فریدی کا ہاتھ بہک

ہی گیا ہو۔ گولیاں اُسے چھلنی کر گئی ہوں۔ اس نے تھوڑی دیر بعد اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔

”ہوں..... تو دیکھو.....!“ فریدی نے کہا اور پھر ٹریگر دبا دیا۔

”اوہو.....!“ بیساختہ حمید کے منہ سے نکلا۔ کیونکہ اس نے اُسے اچھل کر دوسری طرف

جا پڑتے دیکھا تھا۔

”پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔“

”گڈ.....!“ فریدی پر اطمینان لہجے میں بولا۔

”اب اسے کور کئے ہوئے نیچے اتر چلے۔“ حمید نے کہا۔

”قطعی احقانہ بات ہے حمید صاحب۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ میں اُسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”اتنا محتاط میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔“

”بہت دنوں سرگرداں رہنا پڑا ہے اس کے لئے۔ اور بڑی مشکلوں سے آج اسے اس کی کمین گاہ سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ خیر تم دیکھو۔ گاڑی کا لاؤڈ اسپیکر ٹیسٹ کرو۔ مائیک سے کافی لمبا تار اٹنچ ہے۔ اُسے یہاں تک لاؤ..... جلدی کرو۔“
 حمید پھر گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ مونا نے بھی ٹھیک اسی وقت کراہ کر اپنے پیروں کو جنبش دی تھی۔

”مونا.....!“ حمید نے اس کا شانہ ہلا کر آواز دی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔
 ”اٹھو..... ہم نے اُسے گھیر لیا ہے۔“ حمید نے اس سے کہا۔
 ”کسے گھیر لیا ہے.....؟“ وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولی۔
 ”مجرم کو..... اصل مجرم کو..... وہی نقاب پوش؟“

”خدا یا! ڈیڈی مر گئے ہوں..... مر گئے ہوں۔ میرے ڈیڈی۔ اے میرے اللہ..... یہ میری آخری دُعا ہے۔ پھر کبھی کوئی دعا نہیں مانگوں گی۔ اسے قبول کر میرے مالک۔“
 ”مونا..... مونا.....!“ حمید نے اُسے جھنجھوڑ کر آواز دی۔

”مائیک.....!“ چٹان کے قریب سے فریدی غرایا اور حمید بوکھلا کر گاڑی میں گھس گیا۔
 کچھ دیر بعد مائیک فریدی کے ہاتھ میں تھا اور وہ نقاب پوش کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔
 ”اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے اوپر چلے آؤ..... آخری وارننگ.....!“
 حمید پھر مونا کی طرف پلٹ آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اس لڑکی کا ذہنی توازن ڈانواں ڈول ہے۔

”مونا دیکھو..... میرے چیف نے اُسے جکڑ لیا۔“ حمید نے ایک بار پھر اس کا شانہ ہلا کر کہا۔ مونا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے اس طرح آنسو ابل رہے تھے جیسے کسی ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

”تمہیں خوش ہونا چاہئے..... تمہیں خوش ہونا چاہئے۔“ حمید نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”میں خوش ہو جاؤں گی..... تم بھی دعا کرو کہ ڈیڈی مر گئے ہوں؟“

”آخر کیوں.....؟“

دفعۃ فریدی کی آواز پھر پہاڑیوں میں گونجی۔

”اٹھو..... ورنہ پر نچے اڑ جائیں گے۔“

حمید اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مونا بھی اٹھ رہی دیکھنے لگی تھی۔

”نہیں..... دونوں ہاتھ بھی اوپر اٹھاؤ.....!“ فریدی کی آواز پھر چٹان سے ٹکرائی۔

”دیکھو..... شاید اب وہ اوپر آ رہا ہے۔“ حمید نے مونا سے کہا۔

”اور اب ڈیڈی کی گردن شرم سے جھک جائے گی۔ وہ ان کے بارے میں بھی سب کچھ

بتا دے گا۔ یا خدا..... ڈیڈی مر گئے ہوں..... مر گئے ہوں۔“

”حمید میرے پاس آؤ.....!“ فریدی نے مائیک سے منہ ہٹا کر کہا۔

”اے سنبھالو.....!“ اس نے ٹامی گن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ حمید دراڑ سے

دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹامی گن فریدی سے لے کر اس کا رخ اس طرف کر دیا۔ نقاب پوش دونوں

ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے ڈھلان پر چڑھا آ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے قدم لڑکھڑاتے لیکن وہ

ہاتھوں کو نیچے گرائے بغیر ہی سنبھلنے کی کوشش کرتا۔

”ہوشیاری سے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور چٹان کے اس سرے کی طرف چلا گیا

جدھر سے گزر کر آنے والا ان تک پہنچتا۔

جیسے ہی آنے والے نے اس سطح پر قدم رکھا جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے فریدی نے بڑی

پھرتی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”میں اپنی شکست تسلیم کرنے نہیں آیا۔“ حمید نے اس کی غراہٹ سنی اور چونک پڑا۔ کان

آشنا سے معلوم ہوئے۔ کہاں اور کب سنی تھی یہ آواز..... اس نے ٹامی گن کا رخ اس کی طرف

کرتے ہوئے سوچا۔

نقاب پوش کے دونوں ہاتھ فریدی کی گرفت میں تھے اور وہ انہیں چھڑا لینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

”نہیں..... چھچھورے ناول نویس..... اس بار ناممکن ہے؟“

فریدی نے زہریلی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور حمید بیساختہ اچھل پڑا۔ اب اسے یاد آیا کہ اسے یہ آواز جانی پہچانی سی کیوں محسوس ہوئی تھی۔

تو یہ قلندر بیابانی! وہ جو ایک بار فریدی کی گرفت میں آ کر نکل گیا تھا۔ حمید پہلے سے بھی زیادہ الرٹ ہو گیا۔

پھر دفعتاً مونا کے حلق سے ڈری ڈری سے آوازیں نکلتے لگیں۔

نقاب پوش فریدی کو ہلائے ڈال رہا تھا لیکن اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے کسی طرح بھی آزاد نہ کر سکا۔

”حمید اس کی جامہ تلاشی لو.....!“ فریدی نے کہا۔

اور حمید ٹامی گن ایک طرف ڈال کر اس کی طرف بڑھا۔ تلاشی بھی لے ڈالی۔ لیکن اس کے پاس سے ایک بہت بڑے چاقو کے علاوہ اور کچھ بھی نہ برآمد ہو سکا۔ چاقو پر نظر پڑتے ہی مونا کی چیخیں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر چیخنے کا دورہ پڑ گیا ہو۔

”اب میری دائیں جیب سے ہتھکڑیاں نکالو.....!“ فریدی نے پھر حمید کو مخاطب کیا۔

حمید نے ہتھکڑیاں تو نکال لیں لیکن انہیں قلندر کے ہاتھوں میں نہ ڈال سکا۔ کیونکہ ہاتھ چھڑانے کے لئے جدوجہد میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی آ گئی تھی۔

پھر حمید پر جھلاہٹ کا دورہ پڑا..... اس نے ہتھکڑیاں زمین پر ڈال دیں اور جھپٹ کر ٹامی گن اٹھائی اور اس کے بٹ سے تین چار گہری ضربیں قلندر کی گدی پر لگائیں۔ فریدی ہاں ہاں ہی کرتا رہ گیا۔

قلندر کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ لہرا کر ڈھیر ہو گیا۔ پھر حمید نے اس کی پرواہ کئے

۱۔ اس کہانی کے لئے ساتواں جزیرہ اور شیطانی جھیل جلد نمبر 31 ملاحظہ فرمائیے۔

بغیر کہ فریدی اُسے بُرا بھلا کہہ رہا ہے بیہوش ملزم کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال دیں۔
 ”یہ تم نے کیا کیا.....؟“ فریدی کی آواز غصیلی تھی۔

”مت بور کیجئے مجھے۔ اپنے اصول اپنے پاس رکھئے۔ اگر کچھ دیر پہلے اس کا پھینکا ہوا کوئی بم گاڑی پر پڑا ہوتا تو کیا میں اس وقت تبلیغ اخلاق کے کسی جلسے کی صدارت کر رہا ہوتا۔“
 غصے میں بگڑی ہوئی حمید کی صورت دیکھ کر فریدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
 اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ ہیلی کوپٹر کے پر نچے اڑ چکے تھے۔ قلندر کا ساتھی سچ مچ مرچکا تھا۔ اس طیارے کا بھی اب کہیں پتہ نہ تھا جس سے فریدی بذریعہ پیراشوٹ وہاں اُترتا تھا۔
 مونا اب بالکل خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی تھی۔

خوش قسمتی سے گاڑی میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں اُسے دھکیلتے ہوئے سڑک پر چڑھالے گئے۔

قلندر کو رام گڈھ پہنچنے سے پہلے ہی ہوش آ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی خاموش ہی بیٹھا رہا۔
 ورنہ حمید کا خیال تھا کہ ہوش آتے ہی وہ گاڑی سے چھلانگ لگا دینے کی کوشش کرے گا۔
 ”تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ فریدی نے قلندر سے پوچھا۔

”نہیں شکریہ۔ صرف میرے چہرے سے نقاب ہٹا دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔“

فریدی نے خاکی کپڑے کا وہ خول کھینچ لیا جو اس کے چہرے پر منڈھا ہوا تھا۔ مونا جو اگلی سیٹ پر حمید کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی سڑک پر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

قلندر نے لاپرواہی سے اپنے شانوں کو جنبش دی اور بولا۔ ”میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔
 لیکن کرنل فریدی تم میرے توسط سے میرے گروہ کے کسی آدمی پر ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ میں تمہیں ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”وہ خود ہی آ کر سب کچھ بتا دیں گے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ تم سے خائف ہیں اور

متنفر بھی۔“

”یہ غلط ہے۔ وہ مجھ سے خائف تو ہو سکتے ہیں لیکن متفر نہیں۔“

”کچھ تر ایسے آدمی تو میں پیش کر سکتا ہوں جو تم سے متفر ہی نہیں بلکہ تمہارے خون کے

پیاسے ہیں۔ مثال کے طور پر تمہارا وہی لیفٹیننٹ پیش کیا جاسکتا ہے جو تمہارے لئے آپریٹ

کرتا ہے۔ کیا سمجھتے ہو۔ وہ تمہارا آدمی ہے؟“

”اوہ..... تو کیا پولیس.....؟“

”قطعاً نہیں..... اب وہ اس گروہ کیلئے بھی کام کرتا ہے جو گولڈن ایرو کے مقابل کھڑا ہوا ہے۔“

”ہوگا؟“ قلندر نے لاپرواہی سے کہا۔

”اور وہ گروہ میرا ترتیب دیا ہوا ہے۔“

”نہیں.....؟“ قلندر چونک پڑا۔

”تمہیں تمہارے بل سے نکالنے کے لئے بہت کچھ کر گزرنا پڑا ہے۔“

”تمہارے علاوہ مجھے اور کسی کی پرواہ نہیں تھی۔“

”پروفیسر کا کیا قصہ تھا؟ کیا یہ بھی نہیں بتاؤ گے؟“

”سب کچھ میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔ میں کسی کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں گا۔“

اس کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے گولڈن ایرو کے تحت کروڑوں کا بزنس پھیلا رکھا تھا۔ خواہش

تھی کہ اُسے مافیا سے بھی بڑا کاروبار بنا دوں۔“

”تم نے واجد کو کیوں قتل کیا تھا.....؟“

”ہاں..... ایسے سوالات کے جوابات دے سکتا ہوں۔ وہ بے ایمانی پر اتر آیا تھا۔ میں

انہیں زندہ نہیں چھوڑتا جو بزنس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”سارہ رحمان کیوں قتل کی گئی.....؟“

”مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ واجد کے قتل کا منظر اس نے دیکھا تھا۔“

مجھے شبہ تھا اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود ہے جس سے میری شخصیت پر روشنی پڑ سکے گی۔“

”اوہ وہ یقیناً تھا اس کے پاس.....!“

”کیا تھا.....؟“ قلندر نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”تمہارے خون سے بھرے ہوئے ہاتھ کا نشان۔ ایک پرانے اخبار پر۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا.....؟“ حمید بے ساختہ بول پڑا۔ ”مونا نے آپ کو یہ بات نہیں

بتائی تھی۔“

”جتنا بھی اس نے بتایا تھا اسی سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مجھ تک وہی خونی نشان

پہنچانا چاہتی تھی۔“

”لیکن وہ تو..... آپ تو کہہ رہے تھے کہ پرس میں کچھ بھی نہیں تھا۔“

”یہ میں نے لڑکی سے کہا تھا؟ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ واقعی اس پرس کی کوئی

اہمیت تھی یا نہیں۔ اس نے مجھے نقاب پوش اور اس کے دستانوں کی کہانی سنائی اور میں اس نتیجے

پر پہنچا کہ وہ اس کے دوست کے قاتل ہی کے ہاتھ کا نشان تھا۔“

”لیکن وہ آپ کو کب ملا تھا.....!“

”پرس ہاتھ آتے ہی.....!“

”لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی آپ نے یہی کہا تھا کہ اس میں چند

سکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں..... وہ اسی وقت تک کی معلومات تھیں اس کے بعد پرس کا بغور معائنہ کرنے کے

بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ دوہرے پلاسٹک سے بنایا گیا ہے۔ لہذا میں نے اسکی دونوں تہیں الگ کر دی

تھیں اور اخبار کا وہ ٹکڑا دونوں تہوں کے درمیان رکھا ہوا مل گیا تھا۔ میں نے اُسے فنگر پرنٹ

سیکشن کے حوالے کر دیا۔ پرانے ریکارڈوں سے اس کا موازنہ کرنے کے بعد یہ بات پایہ ثبوت

کو پہنچی تھی کہ وہ قلندر بیابانی کے علاوہ اور کسی کے ہاتھ کا نشان نہیں ہو سکتا۔ پھر جب اس نقاب

پوش کی کہانی مجھ تک پہنچی تو!“

فریدی خاموش ہو گیا۔ قلندر آنکھیں پھاڑے غلاء میں گھور رہا تھا۔

کچھ دیر بعد فریدی نے کہا۔ ”اور یہ بھی سن لو کہ اس وقت میں نے تمہیں کیونکر گھیرا تھا۔

تمہارے آدمی اس لڑکی کو اغواء کر لینے کی فکر میں تھے۔ میں نے ان کی اسکیموں کو ناکام بنا دیا۔ تم جھلا گئے۔ تم نے اپنے اس لیفٹیننٹ کو سخت دست کہا جو تمہارے لئے آپریٹ کرتا تھا اور اسے ہدایت کی کہ اب لڑکی کا سراغ پانے کے بعد تمہیں اطلاع دی جائے۔ تم خود ہی اس معاملے کو دیکھو گے۔ تمہارے لیفٹیننٹ نے مجھے اس سے آگاہ کر دیا۔ میں نے لڑکی کو اس پولیس پارٹی کے پاس بھیج دیا جو اسے تلاش کر رہی تھی۔ تمہارے لیفٹیننٹ نے تمہیں اطلاع دی کہ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ چکی ہے اور کیپٹن حمید اس کا بیان لے گا۔ پھر دوسری اطلاع تمہیں یہ ملی کہ میں نے کیپٹن حمید کو لڑکی سمیت دھام نگر طلب کیا ہے۔ پھر تم نے اپنے اسی لیفٹیننٹ کے توسط سے ایئر فورس کے ایک اسکوڈرن لیڈر ایڈورڈ مائیلز سے رابطہ قائم کیا۔ مائیلز بھی اس گندے بزنس میں شریک تھا۔ کسی طرح اس نے تمہاری اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ہیلی کوپٹر کی پرواز کا جواز پیدا کر لیا۔

”اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی واقعہ کیونکر ہوا۔“ قلندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔ ”تم میری گردن بھی کاٹ دینے کی فکر میں تھے؟“

”یقیناً تھا..... مجھے تمہاری بھی فکر تھی اور اس آدمی کی تلاش بھی، جس نے گولڈن ایرو کے مقابلے میں نہ صرف کاروبار کھڑا کیا تھا بلکہ گولڈن ایرو کی ملکیت پر ڈاکے بھی ڈالا کرتا تھا۔ اگر کہیں مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ کرنل فریدی کہ وہ بھی تم ہی تھے تو تم اس وقت بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ صرف تمہیں ختم کر دیتا، کتنی بڑی بات تھی۔ میری مصروفیات دو مختلف سمتوں میں بٹ گئی تھیں۔ اپنی دانست میں تنہا دو مخالف قوتوں سے جنگ کر رہا تھا۔ کاش میں نے صرف تم پر ہی دھیان دیا ہوتا۔“

”ہمیر..... ہمیر.....!“ حمید نے نعرہ لگایا۔ پھر زہریلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”اسی حیرت انگیز صلاحیت کا نام تو کرنل فریدی ہے۔“

کوئی کچھ نہ بولا۔ تھوڑا سا راستہ خاموشی سے طے ہوا تھا پھر کرنل فریدی نے کہا۔ ”کیا سچ

”جتم مجھے پروفیسر کے بارے میں نہ بتاؤ گے۔“
 ”ہرگز نہیں۔“ قلندر غرایا۔

میں تمہاری عزت کرنے پر مجبور ہوں بُرے آدمی۔ مونا روہا سی آواز میں بولی۔ ”وہ زندہ نہ رہیں گے۔ انہیں سوال و جواب کی ندامت سے بچالو۔“
 ”انگاروں کا بستر بھی میری زبان نہیں کھلوا سکے گا۔“ قلندر نے کہا اور سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

پھر رام گڈھ پہنچ کر انہیں اطلاع ملی کہ پروفیسر مر چکا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے ہوش میں آنا افاقۃ الموت ہی رہا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے جسم میں زہر انجکٹ کر دیا گیا ہو۔ بہر حال فریدی نے مشورہ دیا تھا کہ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور کیا جائے۔
 فریدی ہی کے اختیارات خصوصی کی بناء پر ایس پی کرانمر کی گرفتاری بھی عمل میں آئی تھی۔ اس کے خلاف اس کے پاس بہترے ثبوت تھے۔

باپ کے مرنے کی خبر سن کر مونا پہلے تو روتی رہی تھی پھر حمید نے اس کے چہرے پر ایسا سکون دیکھا تھا جیسے خود اس نے دوسری زندگی پائی ہو۔ دوسری زندگی جس میں زندگی کے الجھاوے اور مستقبل کے لئے پریشان کن خیالات نہ ہوں۔

اور پھر اس نے بالکل ہی غیر جذباتی انداز میں وہ کہانی سنائی تھی جسے اب تک چھپاتی آئی تھی۔
 ”ڈیڈی سارا کو بہت چاہتے تھے۔ مجھ سے بھی زیادہ اور وہ بھی اُن کا بہت خیال رکھتی تھی۔ فرصت کے اوقات میں ان کے لئے لیبارٹری اسٹنٹ کے فرائض بھی انجام دیتی۔ ڈیڈی کو کیمیائی تجربات کا خط تھا۔ وہ کینسر کا علاج دریافت کرنے کی فکر میں تھے۔ کوئی ایسی دوا تیار کرنا چاہتے تھے جو اس کے لئے تیر بہدف ہوتی۔ اسی سلسلے میں ایک نیشا سفوف تیار ہو گیا۔ ایسا سفوف جس کا اثر دوسری منشیات کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیر پا ثابت ہوتا تھا۔ یہ ایک مخصوص درجہ حرارت میں تیار ہوتا تھا۔ خشک لکڑی پر کوئی محلول چھڑکا جاتا تھا اور ایک مخصوص درجہ حرارت میں نمی کے ساتھ وہ لکڑی رکھی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد لکڑی کی سطح پر پھپھوندی جسنے لگتی

ہے اور اس کی سطح تیزی سے موٹی ہوتی جاتی۔ پھر اس پھپھوندی کو خشک کر کے سفوف کی شکل میں تبدیل کر لیا جاتا۔ سارہ سے حماقت یہ سرزد ہوئی کہ اس نے اس کا تذکرہ واجد سے کر دیا۔ واجد نے یہ بات نقاب پوش تک پہنچائی اور بلاخر نقاب پوش نے سارہ کو اغواء کر لیا۔ ڈیڈی اس کی گمشدگی کی بناء پر اپنے حواس کھو بیٹھے۔ تب انہیں اسی مردود کا دھمکی آمیز خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر ڈیڈی نے فارمولا اسے نہ بتایا تو وہ سارہ کو قتل کر دے گا۔ اس خط نے ان پر بہت بُرا اثر ڈالا اور ان کا نروس بربیک ڈاؤن ہو گیا۔ بمشکل ان کی حالت سدھری اور وہ نقاب پوش سے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر ملے۔ بڑی دشواریوں سے انہوں نے اسے اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس کے لئے وہ سفوف تیار کرتے رہیں گے لیکن فارمولا نہیں بتائیں گے۔ اس طرح وہ اپنی دانست میں سارہ کی جان بچا سکے تھے۔ برقیاتی ٹمبر پچر سے اتنے اعلیٰ پیمانے پر سفوف کی تیاری ناممکن تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ طور پر کارخانہ قائم کرنا پڑتا اور بات چھی نہ رہ سکتی۔ اس لئے اس مخصوص درجہ حرارت کے لئے رام گڈھ کا انتخاب کیا گیا۔ برف گرنے سے پہلے وہ لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں کو محلول سے تر کر دیتے۔ پھر ان لٹھوں پر برف گرتی اور جب برف پکھلنے لگتی تو انہیں پھر رام گڈھ آنا پڑتا۔ دو مختلف ہوٹلوں میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام ہوتا تھا۔ دلکشا والے سمجھتے کہ وہ موسم گرما میں وہاں قیام کرتے ہیں اور فرار والے انہیں پاگل سمجھتے کہ وہ موسم سرما میں رام گڈھ آتے ہیں۔ یہ انتظام اسی نقاب پوش نے کیا تھا۔ رام گڈھ میں اکثر وہ کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتے۔ جب واپس آتے تو حالت بہت خراب ہوتی۔ بات یہ تھی کہ اس جگہ تک پہنچنے کا راستہ بے حد دشوار گزار تھا جہاں لکڑی کے لٹھوں پر وہ کیمیائی عمل ہوتا تھا۔ اس بار وہ بیماری سے اٹھے تھے۔ واپسی کے سفر میں نقاہت کی وجہ سے کہیں گر کر بے ہوش ہو گئے ہوں گے۔ یہ تھی میرے ڈیڈی کی بے بسی کی کہانی..... اللہ انہیں معاف کرے۔“

حمید اس لڑکی کے لئے بے حد مغموم تھا۔

شام تک فرار و پہنچنے کی نوبت آئی۔ قاسم کی نئی محبوبہ بھی حراست میں لی جا چکی تھی۔ فریدی کا یہ خیال قطعی درست ثابت ہوا تھا کہ وہ قاسم کو اسی لئے اپنے ساتھ رام گڈھ لگالائی تھی

کہ رضیہ یا زبیا کی شناخت ہو سکے۔ ان لوگوں نے قاسم کو عورت کے میک اپ میں پہچان لیا تھا اور فرزانه کی گرفتاری سے یہ بات بھی ان پر عیاں ہو گئی تھی کہ اس سارے سیٹ اپ کا بانی فریدی ہی تھا۔

قاسم نے حمید کو دیکھا اور جڑھ دوڑا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ غصے میں بل بھی کھا رہا تھا اور آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

”خدا گارت کرے تم لوگوں کو۔“ وہ اُسے گھونہ دکھا کر بولا۔ ”اس بار میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور تمہیں بتائے بغیر چپ چاپ یہاں چلا آیا تھا۔ لیکن سارے تم شیطان ہو۔ خبیث ہو..... تمہیں کسی طرح پتہ چل گیا..... اے الامیاں اگر بتاؤں تو مشکل نہ بتاؤں تب بھی میرا ہی بیڑا غرک ہو جاتا ہے۔ میں سالا قیا کروں..... اب تو موت ہی دے دے..... یا پھر ان سالوں کا تبادلہ قرار دے..... ہائے۔“

حمید نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اب اس سے دو چار گز کے فاصلے ہی پر رہے۔ وہ زبیا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو عجیب سی خلش اس کے ذہن میں چھوڑ گئی تھی اور وہاں سے اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی ہو۔

ختم شد